لارک بُک کلب

بنگال میں اجنبی

ایک سفرنامہ

کراچی سے چار مشہور ادیب جو کہ باہم دوست بھی تھے۔ ابراہیم جلیس، ابن انشا، اے حمید اور جمیل الدین عالی — مشرقی پاکستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ریل، ہوائی جہاز اور ناؤ میں جگہ جگہ گھومے۔ آخر بولے۔ ارے یہ تو اپنا ہی ملک نکلا۔ ہم تو خود کو اجنبی سمجھے ہوئے تھے۔

ابراہیم جلیس

ایک روپیہ

سنتے تھے کہ بنگال میں کوئی اجنبی آئے تو وہاں کے
لوگ اس کو جادو سے مکھی بنا کر ڈبیا میں بند کر دیتے
ہیں۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ جادو ہے بنگال کے
لوگوں کا اخلاص اور حُسن بھی۔ اور ڈبیا ہے وہاں
کی خوبصورت سرزمین۔ ہے کوئی جو اس جادو میں
اسیر اور اس ڈبیا میں بند ہونے سے انکار کر سکے!

ناشر : ایم۔ آر۔ خاں
طابع : انٹرنیشنل پریس کراچی

ابراہیم جلیس اُردو نثر کے مشہور شاعر ہیں اس لحاظ سے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ بعض لوگ ان کی شاعری کو مبالغے کے معنوں میں لیتے ہیں اور اس میں شک نہیں مبالغہ شاعری کا ایک ضروری جزو ہے لیکن اصل چیز شاعری میں خوب صورتی اور دلا ویزی ہوتی ہے۔ جلیس کی دوسری تحریروں اور کتابوں کی طرح اس میں بھی وہ جا بجا LYRICAL ہو گئے ہیں۔ کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار۔ پھر موضوع بھی ویسا ہی تھا جو شخص مشرقی پاکستان کی سحر آفریں سرزمین میں چند دن اس شان سے گزارے گا کہ آج کشتی میں ہے کل ہوا میں اُڑا جا رہا ہے اور پرسوں دھوئیں کی گاڑی چھکا چھک اُڑائے لئے جا رہی ہے۔ اس کا ذہن اور قلم کیوں سرشار اور کیف بار نہ ہوگا۔

خود میرا یہ حال ہے کہ اب اتنے دن گزر جانے کے باوجود کبھی کبھی آدھی رات کو عالم نیم خوابی میں یوں لگتا ہے جیسے میں دریائے پدما کی موجوں

پر "آسٹریچ" جہاز کے کیبن میں بیٹھے پکوڑے کھا رہا ہوں۔ کبھی بیٹھے بیٹھے
کسی نامعلوم شاعر کے اشعار زبان پر آجاتے ہیں۔

ترشح ہوتا رہتا ہے گھٹائیں چھائی رہتی ہیں
ہمیشہ وجد میں ندی کی لہریں آتی رہتی ہیں
بہاریں لے رہا ہوتا ہے بل کھاتا ہوا سبزہ
شباب غیرت جنت پہ اتراتا ہوا سبزہ
صدا ناہید کی آتی ہے بیم مرغزاروں سے
ہماری زندگی بہتر ہے لے دل تاجداروں سے

جلیس صاحب تخلیقی کام کے ایسے عادی ہیں کہ ان کے لئے کوئی چیز راست راست بے کم و کاست لکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جس زمانے میں یہ ایک اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھے اس اخبار میں نہایت دلچسپ خبریں آتی تھیں اور لوگ انھیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے لیکن ان خبروں کی اصل واقعات سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی تھی۔ ہم لوگ عید بقرعید پر جھوٹ بولتے ہیں تو پھوہڑ پن کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں۔ جلیس صاحب کا کہنا ہے کہ یہی بات میرے ساتھ ہے۔ مجھے کبھی سچ بولنے کی مجبوری آن پڑے تو ایسے تصنع اور بناوٹ سے بولتا ہوں کہ مخاطب پر بھی کھل جاتا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس رپورتاژ میں انھوں نے جابجا سچ بولا ہے۔

لیکن مجال ہے کہ پکڑے جائیں۔

مجھ سے اس کتاب کا تعارف یا دیباچہ یا پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کرنے والے کے سامنے غالباً یہ امر تھا کہ چونکہ میں اس سفر میں جلیس صاحب کا شریک تھا اور ان کا پرانا دوست ہوں اس لئے ان سبھی واقعات کی تصدیق کروں گا۔ میں لکھتا ہوں چلئے ایک آدھ بات ایسی بھی ہے جس کی میں تصدیق نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے اس وقت میری توجہ کہیں اور رہی ہو سکتا ہے میری یادداشت خراب ہو۔ چلئے یہ بھی مان لیا کہ وہ بات جلیس صاحب کا تخلیقی پیوند ہو لیکن پڑھنے والے کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ کتاب کوئی گائیڈ بک تو ہے نہیں۔ نہ صحیفہ آسمانی ہے۔ بس سفرنامہ ہے رپورتاژ ہے۔ رپورتاژ جمع ہے رپورٹ اور آرٹ کی۔ اگر اس میں سے آرٹ کا عنصر نکال دیں جو معلوم نہیں کیا چیز ہوتی ہے تو خالی رپورٹ رہ جائے گی۔

ہمارے ایک دوست ہیں مرزا عبدالرحمٰن جن کا ذکر اس رپورتاژ میں ملے گا۔ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کے منھ سے انکار ہم نے کبھی نہیں سنا۔ اگر وہ برا نہ مانیں تو ان کو الٰہ دین کے چراغ کا جن کہنا موزوں ہوگا۔ "مرزا صاحب۔ یہ ہوائی جہاز میں ذرا گرد بڑھ ہے۔ باہر

چڑھاکر فوراً ٹھیک کر دیں گے۔ ریل دھکیل دیں گے۔ ٹرک ایک ہاتھ سے روک دیں گے۔ آپ دیکھنا چاہیں تو قطب مینار دلّی سے لے آئیں گے اور پھر واپس گاڑ آئیں گے۔ مرزا صاحب ذرا آسمان میں تھگلی لگا آئیے۔ پل بھر میں یہ بھی ہو جائے گا۔ ہر فن مولا۔ زندہ دل۔ ہر جگہ اثر و رسوخ۔ جلیس نے خسّت سے کام لیا تھا۔ ان کا ذکر کما حقہ نہیں۔ میں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اس کتاب کا نام ہی یہ ہونا چاہیے۔

مرزا عبدالرحمٰن کا سفر مشرقی بنگال

باقی سبھی لوگ تو بس ان کا جلوس تھے۔ جلیس یہ نام رکھنے پر راضی بھی تھے لیکن مرزا صاحب شہرتِ عام اور بقائے دوام سے پرہیز کرتے ہیں انھوں نے منع کر دیا۔

بعض باتیں جلیس صاحب نے ناگفتنی سمجھ کر درج گزٹ نہیں کیں۔ کس طرح ہم لوگ اپنے مشفق دوست جسیم الدین کا کلام سُن سُن کر نڈھال ہوئے ہیں۔ لے حمید تو باقاعدہ غش کھانے اور ہچکیاں لینے لگا تھا لیکن سفر میں معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑا اور سچا شاعر ہے۔ اس دھرتی کی بُو باس اور مزاج اس کوی کے روم روم میں بسا ہوا ہے۔ اے کاش اُردو میں کوئی جسیم الدین ہوتا۔ بایں ہمہ اس سفر میں ہم ایسے اپنائے زمانہ کی سازش کے باعث ایک بار تو بے چارے ایک اسٹیشن پر گاڑی میں سوار ہونے سے رہ گئے۔ کم از کم ہمارا یہی خیال تھا۔ لیکن اگلے اسٹیشن پر پہنچتے ہوئے اور اپنا ڈھیلا ڈھالا مشہورِ تاریخی کریم کلر سوٹ ٹھیک کرتے

ہوئے پھر آن وارد ہوئے تو معلوم ہوا گارڈ نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تھا — فرید پور کے قریب سے گاڑی گزری اور اُنہیں دور اپنا آبائی گاؤں اور اس کی کٹیائیں نظر آئیں تو جو کیفیت ان پر طاری ہوئی وہ کسی صوفی اور دردمند شاعر پر ہی طاری ہو سکتی ہے۔ بناوٹ سے بات نہیں بن سکتی۔

جلیس صاحب دو اور ذکر ذرا مختصر کر گئے۔ ایک تو اس شیر کا قصہ جو چاٹگام کی پہاڑیوں میں کود کر ہماری مائیکرو بس کے شیشے سے لٹک گیا تھا اور جلیس صاحب نے شعر کہہ کہہ کر اسے بھگا دیا۔ یعنی شیر اور شعر کا مقابلہ تھا۔ شیر بھی جلیس صاحب کے بیان کے مطابق جنگلی اور خونخوار تھا میں اتنی بس میں تھا لیکن میں نے نہیں دیکھا۔ مشاہدہ کمزور ہونے کی وجہ سے۔ اور شعر بھی ایسا کہ عروض اور تقطیع اس سے پناہ مانگیں — اے کاش جلیس صاحب اپنا شیر نامہ پورا دیتے۔ فارغ بخاری صاحب نے اپنے رپورتاژ میں بالکل ہی ایک وحشی اور الحاقی چیز نقل کر دی ہے۔ جلیس صاحب کے اشعار آبدار سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو بس اسی قسم کی چیز تھی۔

لے شیر چل چٹگام چل
لے کر خدا کا نام چل
کر خدمتِ اسلام چل

عالی تجھے لے جائیں گے
ایوب سے ملوائیں گے
رکھیں گے تجھ کو گلڈ میں   وغیرہ۔

اسی طرح اس محفل کا ذکر بھی ذرا تفصیل سے ہوتا تو اچھا تھا جو کوی جسیم الدین کی دعوت سے متعلق تھی اور جس میں دیکھنے والوں نے پہلے پہل جھرنا کا بے مثال رقص دیکھا تھا۔ جھرنا سے بھی لوگ متاثر ہوئے لیکن بعد میں جو پر کا کوا بنا اس سے لوگوں کو شکایت ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں فنِ رقص اور اس کا عشوہ و ادا ایک فنِ لطیف ہے اور یہ کم سِن نازک اندام اداکارہ آگے چل کر اور نام پیدا کرے گی۔ کسی شاعر کا اس پر غزل کہنا تو جائز بلکہ شاید مستحسن ہو، لیکن اس سے آگے آیت۔

شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

ہنستے، روتے گاتے بجاتے اونگھتے جھیلتے ہم لوگ کراچی سے ڈھاکے ہوائی اڈے پر اُترے ہیں تو صبح کے چار بجے کا عمل تھا۔ ابھی خاصی سردی تھی۔ ہماری کار ہمیں لے کر پارٹی ہاؤس پہنچی تو وہاں آدم نہ آدم زاد۔ اُتر کر پکارے، دروازے کھٹکھٹائے تو ایک شخص لالٹین لئے لپٹا لپٹایا کچھ سوتا کچھ جاگتا برآمد ہوا۔ ہمارے ساتھ

جو صاحب تھے ان میں اور اس محافظ میں باقاعدہ مناظرہ ہوا جس میں ہم بنگالی نہ جاننے کے باعث حصہ نہ لے سکے اور محض خاموش تماشائی بنے ٹھٹھرتے رہے۔ آخر محافظ صاحب ایک سیر بھر کا چابیوں کا گچھا اُٹھا کے لائے جس میں ایک سو ایک چابیاں تھیں۔ وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے ایک کمرے پر پہونچے اور موصوف نے ایک ایک کر کے تمام چابیاں آزمانی شروع کیں۔ قدرت کو ہمارا امتحان منظور تھا لہٰذا ایک سو ایکویں چابی لگی اور دروازہ کھل گیا کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے لیکن حیف۔ اب معلوم ہوا کہ یہ غلط کمرہ تھا، کسی اور کے لئے ریزرو ہے لہٰذا ایک اور کمرے پر گئے وہاں بھی خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ صحیح چابی ایک سو ایکویں نمبر پر ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم دھڑام سے گر گئے۔

اب اسے ہمیں اور ابراہیم جلیس تو سونے کی فکر میں تھے، میں نے مشورہ دیا کہ سپیدۂ سحری طلوع ہو رہا ہے جاگنا چاہیئے۔ اسی اثنا میں وہ مردِ زنگی کہ نام اس کا کافور یعنی نور محمد تھا نمودار ہوا اور بولا۔ صاب کو لا کھاؤ گے؟ ہمیں نہ کوئلہ کھانے کی شوق نہ راکھ پھانکنے کی لہٰذا ہم نے کہا بھائی ہم کوئی ریل کا انجن تھوڑا ہی ہیں کہ کوئلہ کھائیں گے سیدھا سادا انڈا توس چلے گا۔ کہنے لگا نہیں صاحب یہ ریل والا کوئلہ نہیں کولا ——
ہم نے باہم مشورہ کر کے نتیجہ نکالا کہ غالباً کیلا مراد ہے۔ ان دو صاحبوں نے کہا صبح ناشتے کے ساتھ۔ میں نے کہا میاں نمونہ کلام کے طور پر دو

ایک سے آؤ۔ وہ لے آیا۔ میں نے کہا۔ دو اور۔ جب ہوتے ہوتے ایک
درجن ہو گئے اور میں نے ہل من مزید کا نعرہ لگایا تو ان لوگوں سے ضبط
نہ ہوا اور کہنے لگے۔ بھائی نور محمد ہم بھی کھائیں گے۔ ہمارے لئے بھی کو لاؤ
—— وہاں باغ تھوڑا ہی تھا۔ چار چھ درجن دیکھتے دیکھتے کھیت رہے
تو نور محمد بولا، صاحب۔ اب نہیں ہے، اب تو پیسے دو گے تو اور لاؤں گا۔

ہم تو مہمان تھے، پیسوں کا کیا سوال تھا۔ باقی خوش خوراکی ناشتے
کے لئے ملتوی رکھی اور اب وہ چارپائیاں توڑنے کا ذرا ما شروع ہوا۔
اس تفصیل میں ذرہ بھر جھوٹ نہیں ہے۔

پارٹی ہاؤس کے متعلق ہر کوئی ہمیں نہایت فخر سے یہ مطلع کرنا اپنا فرض
سمجھتا تھا کہ یہ اتنی بڑی عمارت پندرہ دن میں بنی ہے، یہ عمارت طویل
و عریض ضرور تھی لیکن پختگی اور پائیداری میں ان چارپائیوں کی مثال
تھی جو ہم پہلے ہی روز توڑ چکے تھے۔ آخر ایک روز جو ایک صاحب نے
پھر سینہ پھلا کر بتایا کہ صاحب یہ قلعے کا قلعہ پندرہ دن میں تیار ہوا ہے تو
مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھا۔ کہ آخر اتنے دن اس کام میں کیونکر لگے؟
نہایت ہی کاہل اور نوالہ توڑ مزدور ہوں گے۔

ابراہیم جلیس کا یہ پہلا رپورتاژ نہیں۔ اس میدان کے یہ پرانے مرد
ہیں اور واقعی ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیتی باتیں پھر ذہن کے پردے پر متحرک

تصویروں کی صورت اُبھر آتی ہیں۔ گولنڈو سے پاربتی پور اور واپس۔ ڈھاکے
سے چاٹگام اور چاٹگام سے کپتائی اور پھر ڈھاکے سے سلہٹ اور واپسی
جانے کے ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔ پانی ہی پانی۔ ہریالی ہی ہریالی، سڑک اور
ریلوے لائن کے ہر دو طرف مشتاقوں کے ہجوم بلکہ یہ منظر مجھے کبھی نہ بھولے
گا کہ چھتیں اور اُونچے اُونچے درخت ٹیلی فون کے کھمبے اور پانی کی ٹنکیاں
سب پر سے لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ بنگالی مولویوں
کے مسجع و مقفی سپاسنامے بھی ایک نادر چیز تھے اسے کاش جلیس نے ان
کی عبارتیں نقل کی ہوتیں۔ ہمارا قافلہ جہانگیر بادشاہ کے جلوس سے کم نہ
تھا۔ میلوں سے لوگ پیدل چل کر اسے دیکھنے آتے تھے۔ ایک جگہ تو ریلوے
لائن کے جنگلے پر ان کا وہ زور پڑا کہ جنگلہ فرش ہو گیا، محافظین اپنے فرض
سے مجبور کوشش کرتے تھے کہ صدر پاکستان میں اور لوگوں میں فاصلہ رہے۔
آخر حفاظتی تدابیر ضروری ہیں لیکن نہ صدر پاکستان کو اس کا خیال تھا نہ
لوگوں کو، اور بالآخر یہی جیتتے تھے احتیاطات اور پہرے والے ہاتھ ملتے رہ
جاتے تھے ..... لیکن یہ کیا میں تو پیش لفظ لکھتے لکھتے خود رپورتاژ لکھنے بیٹھ
گیا، یہ ابراہیم جلیس ہی کا حق ہے وہی آپ کو یہ منظر دکھائے گا۔ میں خود
قارئین کے ہجوم میں مل کر ایک بار پھر اس الف لیلوی سفر کا لطف اٹھانا
چاہتا ہوں۔

ابن انشا
نومبر ۱۹۶۱ء

(۱)

زمین —— یہ زمین جس پر ہم انسان رہتے بستے ہیں۔ اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی کہ ایک سرخ و سفید رنگ کی متناسب الاعضاء نوجوان عورت خوبصورت ہوتی ہے۔

جس طرح عورت کے جسم کے بعض اعضاء حد درجہ دل آویز ہوتے ہیں، اسی طرح اس پیاری زمین کے بعض ٹکڑے بھی نگاہوں کی "جنت" ہوتے ہیں۔

اس زمین پر نگاہوں کی کتنی جنتیں آباد ہیں —— ! کشمیر، وادیٔ کاغان، کافرستان، سوئٹزرلینڈ۔ جزیرہ کاپری، کیلیفورنیا کا لانگ بیچ، چین کا ہانگ چاؤ اور اپنا مشرقی پاکستان!

پہلی بار جب میں نے جنت نظیر کشمیر کو دیکھا تھا تو اس وقت حیران ہو کر یہ سوچتا

رہا تھا کہ

"کیا یہ زمین کی خوبصورتی کی انتہا نہیں ہے"؟

اور آج بھی جب میں دریائے کرنافلی کی اونچی نیچی پہاڑیوں کے دامن
میں رنگ برنگے چکمہ قبیلے کی نیم عریاں دوشیزاؤں کے درمیان کھڑا ہوں۔ یہی سوچ
رہا ہوں ——— لیکن اب مجھے اپنے بڑے پرانے سوال کا جواب
مل گیا ہے کہ۔۔

"زمین کی خوبصورتی کی کوئی انتہا نہیں ہے"

اور شاید اسی لئے انسان مر مر کر زندہ رہنے کے باوجود اسی کی چھاتی
سے چمٹا رہتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اسے نہیں چھوڑتا۔ مر کر بھی اسی میں دفن ہو
جاتا ہے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اور جب سے تاریخ سفرناموں
کہانیوں اور گیتوں کی کتابوں میں بنگال کو پڑھا ہے اور جغرافیہ کی کتابوں اور
نقشوں میں جب سے بنگال کو اس کے کھیتوں میں لہلہاتا، اس کے پہاڑوں
میں بلند ہوتا اور اس کی لمبی کالی، چمکیلی زلفوں والی سانولی سلونی عورتوں میں جوان
ہوتا دیکھا ہے ——— میرا دل بنگال کے لئے دھڑکتا رہا اور
میرے دل کی ہر دھڑکن چپکے چپکے مجھ سے یہی کہتی تھی
دھڑک دھڑک ——— بنگال چلو

دھڑک دھڑک ——— بنگال چلو

لیکن ابتداء میں ہر خوبصورت چیز اور انسان کے درمیان ایک فاصلہ ضرور
ہوتا ہے اور ہر انسان کو خوبصورتی کے حصول کے لئے پہلے کوئی نہ کوئی فاصلہ
ضرور طے کرنا پڑتا ہے۔

میرے اور مشرقی پاکستان کے درمیان بھی یہی فاصلہ حائل تھا ———
بارہ سو میل لمبا فاصلہ،

اور میں ہمیشہ تصور کے افق پر کھڑا بارہ سو میل دیکھا کرتا تھا۔
حدِ نظر تک سبزپوش پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے ڈھلانوں پر چائے
کی سبز چمکیلی پتیوں والے باغات مہک رہے ہیں۔ ان پہاڑوں کے دامن
میں مچلتی ہوئی چاندی جیسے پانی کے دریا ——— پدما، میگھنا، کرنافلی
اور برہم پترا اپنی آغوش میں لاتعداد بادبانی کشتیوں، بانس کی مقعر چھتوں والے
ڈونگوں، لمبی چمنیوں والے انجنوں اور اسٹیمروں کو اٹھائے بہہ رہے ہیں۔
ان دریاؤں کے ساحلوں پر بانس کے مثلث نما چھتوں والے چھوٹے
چھوٹے گھر ہیں ہرے ہرے بڑے بڑے پتوں والے کیلے کے درخت، شیشم
اور ساگوان کے درخت۔ ساپنجی اور بنگلہ پان کے کھیت، نیشکر کے کھیت،
سنہرے ریشے والے پٹ سن کے کھیت، چائے اور انناس کے باغات، اور
بانس کے اونچے اونچے اور گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں مست ہاتھیوں

کے خواب بھرتے ہوئے اور دھاریوں والی کھال میں ملبوس جنگل کا بادشاہ
—— شیر اپنی بادشاہت کے اعلان کے لئے دھاڑتا پھر رہا
ہے۔

بمبو کے بنے مکانوں، چونے اور اینٹوں کے سُرخ اور سپید اونچے
گھروں کے درمیان سڑکیں ہیں، جن پر سیاہ اور سانولے رنگ کے مرد اور عورتیں
اور بچوں کا ایک ہجوم ہے رکشاؤں پر آدمی پر آدمی سوار بھاگے جا رہے ہیں
زندگی رواں دواں —— رواں دواں ہے۔
کشتیوں کے گھاٹ پر رُکے اور کشتیاں اور لانچیں اور اسٹیمر کھڑے
ہیں، مچھیروں نے دریاؤں میں جال پھینک رکھے ہیں اور دھان کے کھیتوں اور چائے
کے باغات میں بڑی بڑی کاجل بنا کالی آنکھوں اور کمر تک لمبی کالی زلفوں
والی عورتیں جھوم جھوم کر گا رہی ہیں۔

بندھوا رو نگیلا رے نگیلا رو نگیلا رے
رو نگیلا رے ——

بنگال کی عورتوں کی زلفیں اور آنکھیں اور بنگال کے لوک گیت
—— جب آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں تو پھر بنگال کا مشہور عالم جادو

بھر بنگال، وجود میں آجاتا ہے۔
وہی بنگالے کا جادو، جس کے زیر اثر ہر شخص سنبھلنے سے اب تک میں
ساکت و صامت تعصبات کے کانٹوں پر پڑا تھا اور خوابوں کے جزیروں میں
بھٹک رہا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔
دھڑک دھڑک —— بنگال چلو، بنگال چلو۔

اور ایک دن صبح سویرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی لیکن وہ میرے دل
کی دھڑکن نہیں بلکہ ایک جانی پہچانی اور بڑی پیاری آواز تھی۔
بنگال چلو گے —— ؟
یہ آواز ملک کے بلبل آواز پاکستان کے نوجوان جیالے اور البیلے شاعر جمیل الدین
عالی کی تھی۔ مجھے عالی اور عالی کی شاعری دونوں سے پیار ہے چنانچہ وہ آواز
عالی کی آواز بھی تھی اور میرے دل کی دھڑکن بھی!
عالی کہہ رہا تھا ——
دنیا کا محبوب صدر محمد ایوب خان اپنے بارہ سو میل دور رہنے
والے ساڑھے چار کروڑ بھائیوں اور بہنوں سے ملنے، اور انہیں
جمہوریت اور نئی زندگی کے تحفے دینے مشرقی پاکستان جا رہا
ہے ——

آؤ کہ ہم بھی یہ نظارہ دیکھنے چلیں کہ: ——

کہ کس طرح ساڑھے چار کروڑ انسان ایک انسان میں سمٹ آتے ہیں: ——

اپنے ملک کی تاریخ کا یہ پہلا اور انوکھا واقعہ ہے کہ ملک کا سب سے بڑا حاکم اپنے ملک کے باشندوں سے فرداً فرداً ملنے کے لئے سفر پر روانہ ہوا ہے۔

ایسا اس سے پہلے بھی ہو چکا تھا میں نے اخباروں میں بھی پڑھا تھا اور حالی نے بھی مجھے نہایت تفصیل سے بتایا تھا —— کہ ایوب خان نے اس سے پہلے مغربی پاکستان کے ساڑھے تین کروڑ باشندوں سے فرداً فرداً ملنے کے لئے کیماڑی سے درہ خیبر تک سفر کیا تھا۔

اور اس سفر میں ساڑھے تین کروڑ پاکستانی باشندے ایوب خان کی ایک شخصیت میں سمٹ آئے تھے۔

مجھے دوہری خوشی ہوئی، ایک تو میں اپنے خوابوں کی سرزمین مشرقی پاکستان جا رہا ہوں، اور دوسرے میں وہ عجیب و غریب منظر دیکھنے جا رہا ہوں جس میں کروڑوں منتشر بکھرے ہوئے انسان سمٹ کر ایک مجمع بن جاتے

ہیں اور پھر وہ مجمع ایک انسانی جسم بن جاتا ہے۔

میں نے حالی کو جواب دیا:-

میں بالکل تیار ہوں، مگر مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ ملک کے اعلیٰ ترین حاکم کی ہمسفری کی جرأت ادیبوں کو بھی مل سکتی ہے —— ؟

جواب میں حالی نے مجھے فلسفہ اتحاد و اجتماع جسم کا کوئی فلسفہ سمجھانا شروع کر دیا کہ:-

"جس طرح فرد ربط ملت سے قائم ہے۔ اسی طرح ادیب بھی تنہا کچھ نہیں ہے" ادیبوں کے "اتحاد" کو دکھا دو اور ایوب کو دکھائیں دو کہ:-

اب گویا "غزنوی" فردوسی پر ریجھ گئی ہے، فردوسی کی لاش پر نہیں۔

اور پھر حالی نے یہ بھی کہا کہ: ——

"اب تم، میں، ابن انشاء اور حفیظ جالندھری الگ الگ رائٹر نہیں۔ بلکہ ہم "رائیٹرز گلڈ" ہیں ——"

حالی کی یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں، کیونکہ اس وقت میں نہ صرف بہت خوش تھا بلکہ تصور ہی تصور میں جیسے مشرقی پاکستان پہنچ چکا تھا۔

خوشیاں بہت سی تھیں۔ اس سفر میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، ابن انشاء

اے حمید، جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب جیسے پیارے ساتھی اہلِ قلم ساتھ ہیں۔

اس سفر میں اس ملک کا سب سے بڑا آدمی چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے ملنے جا رہا ہے۔

اس سفر میں مجھے قدرتی خوبصورتیوں سے مالا مال سرزمین اور اس کے انسانوں کو اکٹھے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔

انسان کے بغیر خوبصورت سی زمین بھی خوبصورت نہیں۔

مشرقی پاکستان کے سبزپوش پہاڑ، گھنے جنگل، لہلہاتے کھیت اور چمکتی ہوئی چاندی جیسے پانی کے دریا، مہران اور گنگے ہیں۔ اگر ان کے پیش منظر میں انسان نہ ہوں۔ اور مجھے قدرتی خوبصورتیوں سے مالا مال اتنے دلاویز پس منظر میں ایک نہیں، دو نہیں، پورے ساڑھے چار کروڑ انسانوں کو دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔

تصور کا دھندلکا چھٹا تو میرے سامنے چیک بک جیسی دلآویز سبز رنگ کی ایک چھوٹی سی کتاب رکھی ہوئی تھی، وہ کتاب نہیں تھی۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کا ایک ٹکٹ تھا۔

اور ابن انشاء ٹیلی فون پر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"تم سامان لے کر سیدھے میرے گھر پہنچو۔ لاہور سے حمید بھی آ گیا ہے اسے پک اپ کرتے ہوئے ایئرپورٹ

جانا ہے۔"

سال ۱۹۶۰ء کی آخری رات ہے!

اور رات کے ساڑھے نو بج رہے ہیں!

کراچی ایئرپورٹ کی جگمگ جگمگ عمارت میں ہم سب دوست مسافر اکٹھے ہو چکے ہیں۔ جمیل الدین عالی۔ ابن انشاء، اور اے حمید اور میں!

ملاقاتیوں کی مدد و رگیری کے سامنے پی آئی اے کا ایک حسین مرغ جیسا چمکیلا سفید سپر کانسٹیلیشن طیارہ اپنے بڑے بڑے پر پھیلائے کھڑا ہے۔

ایک بنگالی دوشیزہ جس کا چہرہ سرخ سیب جیسا ہے، جس کے بال سیاہ چمکیلے اور گھنگھریالے ہیں، جس کے سر پر سبز رنگ کی ایک چھوٹی سی گول ٹوپی ہے، جس کے چست اور چھریرے جسم پر سبز رنگ کی قمیص منڈھی ہوئی ہے، جس کے سینے کے گداز پر سفید دوپٹہ کا بنا ہوا V بنا ہوا ہے اور جس کی ٹانگوں میں سفید براق شلوار ہے ——— اس حسین مرغ سپر کانسٹیلیشن کی طرف بڑھ رہی ہے

نگاہوں کے سامنے صدیوں پرانا الف لیلہ کا ایک منظر ہے اور میں

اسی طرح بھاگا ہوں جیسے سندباد جہازی قوی ہیکل دیو نما رُخ کے سامنے
سہما کھڑا تھا۔

سندباد جہازی کی طرح یہ میرا بھی ساتواں ہوائی سفر ہے۔

سیمیں رُخ سپر کانسٹیلیشن کے اڑنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی
ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے جام صحت پی رہے ہیں اور باتیں کرسٹوفر کولمبس
واسکوڈی گاما۔ ابن بطوطہ اور چینی سیاح ہیون سانگ کی ہو رہی ہیں۔
چینی سیاح ہیون سانگ بھی صدیوں پہلے مشرقی پاکستان گیا تھا۔
اور آج صدیوں بعد میں بھی ہیون سانگ کی طرح مشرقی پاکستان ہی جا
رہا ہوں۔
ہیون سانگ اور میں ——— میں صدیوں پہلے ہیون سانگ کے
ہمراہ ایک بدھ کھشو کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔
مگر ابن انشا مجھے بتاتا ہے کہ ———
"یہ گوتم بدھ کے پگوڈا کی سیڑھیاں نہیں پی آئی اے کے
سپر کانسٹیلیشن کی سیڑھیاں ہیں"
ہوائی جہاز کے دروازے میں کھڑی پی آئی اے کی "سبز پری"

مسکرا کر میری طرف دیکھتی ہے۔
"گڈ نائیٹ"
"گڈ نائیٹ"

افسانہ نگار ایک طرف۔ شاعر ایک طرف ہیں اور حمید ایک ساتھ
اور عالی اور ابن انشا ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ ہم نے اپنی اپنی سیٹ بیلٹس باندھ
لی ہیں۔ اور لاؤڈ اسپیکر پر ہوا باز ہم سے مخاطب ہے۔
"خواتین و حضرات السلام علیکم ——— میں آپ سب کو
خوش آمدید کہتا ہوں۔ ابھی ایک لمحہ کے بعد ہمارا سفر شروع
ہو گیا ہے اور چھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا یہ خوشگوار
سفر ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر ختم ہو جائے گا۔"
جہاز کے چاروں پنکھے پوری تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں اور ہمارا سیمیں
مرغ چلنے اور اڑنے ہی والا ہے۔
پی آئی اے کا سپر کانسٹیلیشن سیمرغ بڑے باوقار انداز میں بڑے بڑے
پر پھیلائے اٹھلاتا ہوا "رن وے" پر چلنے لگا ——— ایئرپورٹ کی جگمگ
عمارت کی بیرونی گیلری میں ہم سارے مسافروں کے رشتہ داروں اور دوستوں
کے ہاتھ اور رومال ہل رہے تھے۔
ایئرپورٹ کی جگمگ عمارت دور ہوتی گئی ——— سبزہ

کانسٹیلیشن اب مڑنے لگا تھا۔ رن وے کے داہنی طرف والی لال لال لائیٹوں
کی ایک قطار تھی ——— سوپر کانسٹیلیشن دور اندھیرے میں جا کر
رکا اور پھر مڑا ———

چاروں پنکھے اور زیادہ تیزی سے گھوم رہے تھے۔ پھر اچانک سوپر
کانسٹیلیشن میں جنبش ہوئی اور سوپر کانسٹیلیشن پوری رفتار کے ساتھ دوڑنے لگا۔
ایئرپورٹ کی جگمگ جگمگ عمارت بڑی تیزی کے ساتھ قریب آ رہی
تھی اور پھر وہ عمارت شوں کے ساتھ پیچھے گزر گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو
کراچی ایئرپورٹ ——— ایئرپورٹ کا ایک ننھا سا ماڈل نظر
آ رہا تھا۔

اور پھر وہ کراچی جس کی فلک بوس عمارتوں کے سامنے میں اپنی ورلڈ
ناتی کو بھول کر عجیب طرح کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اب اپنی
بے شمار جھل مل جھل مل آنکھوں کو جھپکا جھپکا کر قعرِ پستی سے میری رفعتوں
کو دیکھ رہا تھا۔

پی آئی اے کا قوی ہیکل پرندہ اپنے دونوں بڑے بڑے پر پھیلائے
کراچی پر منڈلا رہا تھا۔

کراچی جو انسان کی سماجی زندگی میں بہ یک وقت ظلمتوں اور روشنیوں
کا شہر ہے اب بیچ بیچ اجالوں اور اندھیروں کا شہر بنا ہوا ہے۔

رن وے کی لال لال روشنیوں کی قطار اور کراچی کی شاہراہوں پر سٹریٹ
پر لیمپس کی چمکیلی دودھیائی بتیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ آسمان پر کسی
تنک مزاج حور نے اپنے محبوب کسی جنتی انسان سے جھگڑ کر اپنے گلے سے یاقوت
اور نیلم کی مالائیں اتار کر زمین پر پھینک دی ہیں۔

ہوائی جہاز اور اونچا ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے نیچے کراچی شہر نہیں
ہے بلکہ ٹوٹے ہوئے تاروں کا ایک ڈھیر ہے ——— یا پھر
کراچی انسانوں کا شہر نہیں ہے ——— لاتعداد ——— جگنوؤں کا
مسکن ہے۔

پھر جیسے اچانک دو جگنو میری آنکھوں کے آگے دمک چمک اٹھے
وہ دو جگنو نہیں تھے ——— پی آئی اے کی سبز پری کی دو سیاہ چمکیلی
آنکھیں تھیں۔ اس کے سرخ سرخ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور اس کے ہاتھوں
میں ایک ٹرے تھی جس میں رنگ برنگے حلاوت آگیں لوزنجر اور پیپر منٹ تھے
——— !

میں نے اس کے سرخ سرخ ہونٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے ٹرے میں سے دو لمبے
لمبے اور پتلے پتلے سرخ سرخ پیپر منٹ اٹھا لئے ——— اور ان
پیپرمنٹس کو منہ میں ڈال کر مٹھاس اور لذت کے تصور سے لطف اٹھانے لگا۔
جب سبز پری چلی گئی اور میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو باہر گہرا

اندھیرا تھا۔ زمین بہت نیچے رہ گئی تھی اور آسمان بہت اوپر تھا۔

میرے سارے مسافر ساتھی اپنی اپنی نشستیں دراز کر کے سونے کی تیاریاں کرنے لگے ——— میرے سامنے اوپر والی بتی آن ہو گئی

NO SMOKING
FASTEN SEAT BELTS

حروف حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور غم غلط کرنے لگا ——— دراصل مجھے زمین سے بے انتہا پیار ہے ——— اپنی پیاری زمین سے عارضی جدائی اور تھوڑی دیر کا سفر بھی مجھے بہت غمگین بنا دیتا ہے۔

نیچے زمین اندھیرے کا دبیز سیاہ کمبل اوڑھے سو رہی تھی اور مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اندھیرے کے اس دبیز کمبل کے پیچھے کوئی اور بھی میرے لئے جاگ رہا تھا۔ اس نے گھر کے دروازے سے باہر نکلتے وقت میری بانہہ پکڑ کر کہا تھا۔

"جب تک تمہارے پیرے زمین پر صحیح سلامت اتر جانے کی خبر نہیں آئے گی۔ میں بالکل نہیں سو سکوں گی ———"

اسی لئے میں بھی نہیں سو سکتا تھا۔ انسان یا تو زمین پر سوتا ہے یا آسمان پر

سوتا ہے ——— زمین اور آسمان کے درمیان بھلا کیسے سو سکتا ہے!

میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا کوئی بھی مسافر ساتھی نہیں سو رہا تھا ——— سب آنکھیں بند کئے جاگ ہی رہے تھے۔ میں بھی جاگ رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا اور اس خواب سے کبھی کبھی پی آئی اے کی سبز پری اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گزر جاتی تھی۔

جب تک ہم پاکستان کی ہواؤں میں اڑتے رہے، نیچے جو اندھیرا تھا وہ رات کا اندھیرا تھا۔

مگر جب پی آئی اے کا پرندہ اپنے لمبے چوڑے پنکھ پھیلائے ہندوستان کی ہواؤں میں داخل ہوا ——— نیچے کا سارا اندھیرا جنگ کا اندھیرا بن گیا۔

اس اندھیرے میں کہیں کہیں بہت سے جگنو چمکتے دمکتے نظر آتے تھے اور دل کہتا تھا۔

شاید یہ دہلی کے جگنو ہیں یا علیگڑھ کے جگنو ہیں

یہی کہ اندھیرے میں بھی مڑ کر دیکھو مجھے دہلی اور علیگڑھ اسی طرح اب تو جگمگاتا ہے، جیسے اس ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جگمگ کرتا نظر آ رہا ہے۔

اس اندھیرے میں یادوں کی کتنی گمشدہ جنتیں چھپی ہوئی ہیں

اس اندھیرے میں مجھ سے وہ ماں بچھڑ گئی ہے جس کا نام مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہے — اس اندھیرے میں اسٹریچی ہال ہے — مزمل ہوسٹل کا کمرہ نمبر ۲۷ ہے، جس کی آغوش میں بچے سے جوان ہوا تھا اور جس کے دروازے سے میں بی اے کی ڈگری لے کر نکلا تھا۔

اس اندھیرے میں وہ دلی ہے جہاں میری جوانی نے دل کا پہلا سودا کیا تھا ـــــــ اے چاندنی چوک کی وہ یادگار شام!

نیچے اسی اندھیرے میں دلی والے مغل بادشاہ شاہجہان کا وہ مرمریں خواب تاج محل بھی ہے جس کی آغوش میں اس کی زندگی ممتاز محل صدیوں سے میٹھی نیند سو رہی ہے۔

وقت کا پرندہ بھی اڑ رہا ہے اور پی آئی اے کا پرندہ بھی۔

اب غالباً ہم الہ آباد یا بنارس پر سے اڑ رہے ہیں، کیونکہ نیچے زمین پر بہت سے جگنو اکٹھے ہو گئے ہیں۔

الہ آباد ہو یا بنارس ـــــــ اس زمین کو دیکھ کر دل میں بڑی میٹھی میٹھی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں ـــــــ دل بڑے والہانہ انداز میں دھڑک رہا ہے۔ کبھی اس زمین پر ہم آزادی سے گھوما کرتے تھے۔

ـــــــ اس زمین پر دوستوں اور رشتہ داروں کے گھر تھے جن گھروں میں پیار کے پھول مہکتے تھے۔

اسی اندھیرے میں کہیں جنوب کی طرف ایک اور بھی گھر ہے ـــــــ جس میں میرا بوڑھا باپ، میری بوڑھی ماں اور میرے جوان بھائی شاید اس وقت سو رہے ہیں، اور انہیں پتہ ہی نہیں کہ ان کا ایک پیارا جس کی شکل گیارہ سال سے ان کی نظروں سے اوجھل ہے ـــــــ اس وقت ان کے ہندوستان کی ہواؤں میں اوپر ہی اوپر سے گزرا چلا جا رہا ہے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا ـــــــ مگر دل پکار رہا ہے۔

پیاری پیاری صورتو

رس بھری مورتو

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دو بار ـــــــ چین جاتے ہوئے اور چین سے واپس آتے ہوئے میں اوپر اسی فضا سے اس ہندوستان کے اوپر سے اڑ چکا ہوں۔ جہاں میرا بچپن، میرا عنفوان شباب، اور میرا جگمگاتا ماضی نیچے زمین میں دفن ہو گیا ہے۔ کلکتے کے دم دم ایئرپورٹ اور دہلی کے پالم ایئرپورٹ پر میں اپنے آنسو نہ روک سکا تھا ـــــــ اب بھی میری آنکھیں نمناک ہیں۔

چونکہ لاؤڈ اسپیکر پر ہوا باز کی آواز گونجتی ہے۔

"خواتین و حضرات —— ابھی پانچ منٹ کے اندر ہم ڈھاکہ کے ہوائی اڈے تیج گاؤں پر اترنے والے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔"

سامنے پی آئی اے کے کتبے پھر سے روشن ہیں۔

NO SMOKING
FASTEN YOVR SEAT BELTS

میں نے اپنا سگریٹ بجھا دیا ہے —— اور سارے مسافر ساتھی اپنی اپنی کمر بند کس رہے ہیں۔

اب پی آئی اے کا قوی ہیکل پرندہ فضا سے نیچا ہو کر ڈھاکہ شہر پر منڈلا رہا ہے۔

نیچے زمین پہ چہرے جگمگانے لگے ہیں۔ ڈھاکہ کی زمین اسٹریٹ لیمپ کی مالائیں گلے میں پہنے ہوئے ہے۔ اس کے لباس میں روشنیوں کے بے شمار ہیرے ٹنکے ہوئے ہیں۔ ڈھاکہ کی زمین کا حسن جاگ رہا ہے لیکن ڈھاکہ کی زمین ابھی سو رہی ہے۔ ابھی تو رات کا پچھلا پہر ہے۔

میں کھڑکی سے جھانک کر خوشی سے چیخ اٹھتا ہوں۔

"ڈھاکہ —— !"

اس وقت میری خوشی کرسٹوفر کولمبس کی سی خوشی ہے جو مہینوں کے طویل سفر کے بعد امریکہ کی زمین کو دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھا تھا۔

"میلوڈی کا —— !!"

کولمبس بحر اوقیانوس کو عبور کر کے امریکہ پہنچا تھا۔ اور میں اندھیرے کے سفر کو عبور کر کے ڈھاکہ پہنچا تھا۔

پی آئی اے کے پرندے نے ڈھاکہ کی زمین کو چوم لیا تھا۔ اب پی آئی اے کا پرندہ تیج گاؤں کے ہوائی اڈے کی مختصر سی عمارت کے سامنے کھڑا ہے۔

ہوائی جہاز کا دروازہ کھل گیا ہے۔ دروازے سے سیڑھی لگا دی گئی ہے۔ دروازے میں پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس ہم مسافروں کو الوداع کہنے کھڑی ہے۔ اس کے سرخ سرخ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ہے۔

"گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ اینڈ گڈ بائی مائی ڈیئر ڈیمسل آف دی ایئر"

تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کا عالم طاری ہے۔

ہمارے میزبانوں کے نمائندے مسٹر منان آف ریڈیو پاکستان سامنے
کھڑے ہیں۔

"بھالو آشے منان صاحب"

"بھالو آشے۔ بھالو آشے"

ہماری موٹر کاریں ڈھاکہ کی سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں۔ ڈھاکے کی فضاؤں
میں رات کے اندھیرے اور صبح کے اجالے میں آخری معرکہ ہو رہا ہے
مشرق کی سمت سے صبح کے اجالے کا غبار اڑتا چلا آ رہا ہے۔

میں ابن انشاء، اے حمید اور جمیل الدین عالی ———

ہم روشنیوں کے مسافر روشنی ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر ہمارے میزبان
مسٹر منان تو ڈرائیور سے کہہ رہے ہیں۔

"پارٹی ہاؤس ——— آجم پورہ ———"

عظیم پورہ کیا ہے ——— ابھی ہم نہیں جانتے ———
صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم ڈھاکہ کے عظیم اور تاریخی شہر کی سڑکوں پر سے
گزر رہے ہیں۔

ابھی تو ڈھاکہ شہر ہمارے لئے وہی ڈھاکہ ہے، جو تاریخ کی کتابوں
میں ہے۔ جتنا کچھ ڈھاکہ تاریخ کی کتابوں میں دیکھا ہے، اتنا ہی ڈھاکہ اب
موٹر کار کی کھڑکی سے بھی نظر آ رہا ہے۔

کچھ روشنی تاریخ ڈالے گی اور کچھ اجالا تھوڑی دیر بعد طلوع ہونے والے
سورج سے ملے گا۔

پھر سارا ڈھاکہ عین نگاہوں کے سامنے ہوگا۔

سپیدۂ سحر پھیل رہا تھا۔

ہماری کار فوجی بیرکس یا پھر کسی ہائی سکول کے ہوسٹل جیسی ایک قدیم عمارت
کے پورچ میں رکی۔

یہ پارٹی ہاؤس تھا۔

ہمارے میزبان مسٹر منان نے ہمیں بتایا کہ یہ پارٹی ہاؤس مارشل لا کے
نفاذ سے پہلے مشرقی پاکستان اسمبلی کے اراکین کی قیام گاہ تھا۔ اور یہ عمارت صرف
پندرہ دن میں تعمیر کی گئی ہے۔

منان صاحب اگر یہ نہ بھی بتاتے تب بھی عمارت کا حلیہ یہی بتا رہا تھا
کہ یہ عمارت ہنگامی حالات میں حکومتوں کی جلد بازی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

ابن انشاء، اے حمید اور میں نے اپنے لئے ایک کمرہ منتخب کیا ———
کمرہ کھلا تو مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مزمل ہوسٹل یاد آ گیا ——— یہ
عمارت علی گڑھ کے ہوسٹلوں سے بڑی مشابہ تھی۔

جمیل الدین عالی "دن بخیر" کہہ کر اپنے ہم زلف کے گھر چلے ——— گئے

——— ابن انشاء نے چاہا کہ تھوڑی دیر سو لیا جائے۔ لیکن ہم نے حمید اور

میں سونے کے خلاف تھے —— بھلا تو انسان کو جگاتا ہے ——
مگر ابن انشاء پر قنوطیت طاری تھی اور وہ "اجالے اور بیداری" کے فلسفے
پر ہم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مجھے
اور اے حمید کو غصہ آگیا کہ ابن انشاء کمرے میں قنوطیت پھیلا رہا ہے۔ اس
لئے اے حمید اس کا کمبل چھیننے اس کی طرف بڑھا —— تھوڑی دیر دونوں
میں چھینا جھپٹی رہی اور پھر —— تڑاق پڑاق —— کی آواز
گونجی —— اور میں نے دیکھا کہ
ابن انشاء اپنے پلنگ کے تختوں سمیت فرش پر تھا۔ اور پلنگ اس
طرح ٹوٹ گیا تھا، جیسے زلزلے میں کوئی کمزور سی عمارت ٹوٹ پھوٹ کر
بکھر جاتی ہے۔

بڑی مشکل سے ابن انشاء کو باہر نکالا گیا اور یہ طے پایا کہ فی الحال
دوسرا پلنگ آنے تک ابن انشاء اور میں پلنگ پر سوئیں لیکن جب میں
اور ابن انشاء ایک ساتھ پلنگ پر بیٹھے تو یوں محسوس ہوا، جیسے ایک بار پھر زلزلہ
آیا ہے۔ میں گھبرا کر پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا —— اور پھر ان پلنگوں
سے پتہ چل گیا کہ مشرقی پاکستان اسمبلی کے اراکین یعنی پرانے سیاستدان
کتنے بے وزن لوگ تھے !!

ادھر اے حمید کا یہ حال تھا کہ اسے جب بھی کھانسی آتی تو وہ بڑی آہستگی

سے پلنگ سے اٹھتا۔ فرش پر کھڑا ہو کر کھانستا اور پھر اسی آہستگی کے ساتھ
پلنگ پر لیٹ جاتا —— میری یہ بات مبالغہ بھی ہے اور حقیقت
بھی —— ویسے یہ پلنگ مشرقی پاکستان کے سیاستدان اراکین اسمبلی کے
لئے موزوں تھے —— کیونکہ وہ لوگ ہی ہلکے تھے۔
آدمی کے جسم میں وزن کے لئے "ایمان" کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی —— اور دروازہ کھلا ——
ایک پستہ قد، سیاہ فام، جنگلی داڑھی اور نیلی لنگی والا شخص کمرے میں داخل ہوا،
اور بولا:-

"بیڈ ٹی منگتا ہے —— ؟"

ہم نے اثبات میں سر ہلایا اس نے پوچھا:-

"کرنیلا بھی منگتا ہے —— ؟"

"کرنیلو —— " ہم بڑے حیران ہوئے۔ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے
—— لیکن وہ ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔ ہم نے سوچا،
شاید یہ شخص دانت مانجھنے کے لئے کرنیلو لانے گیا ہے مگر جب وہ
واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے اور ٹرے میں بڑے بڑے کیلوں کی ایک
طشتری تھی۔

وہ شخص پارٹی ہاؤس کا خانساماں نور محمد تھا۔ اس وقت کمرے سے باہر
صبح کا نور تھا اور کمرے میں نور محمد تھا اور ہم کیلے کی تعریف کر رہے تھے اور
نور محمد کہہ رہا تھا۔

صاحب۔ ادھر میں جتنا کیلا لگتا ہے کھاؤ ——
ادھر میں کیلا بہت سستا ہے ——

کیلوں نے ابن انشاء کی بھی نیند اڑا دی تھی —— ہم نے کہا۔
اب سونا فضول ہے —— اور ہم سونے کے لئے تو مشرقی پاکستان نہیں آئے
تھے۔ ہم تو جاگنے اور جاگتے ہوئے مشرقی پاکستان کو دیکھنے آئے تھے،

ناشتے کے بعد ہم ڈھاکہ شہر گھومنے کے ارادے سے پارٹی ہاؤس سے
نکل رہے تھے کہ ہوائی جہاز کے ایک ہمسفر ہم سے ملے۔ انہوں نے اپنا تعارف
کرایا۔ مرزا عبدالرحمٰن! اس تعارف سے پہلے عالی نے ضمناً طور پر ان کا تعارف
کرا دیا تھا —— مرزا عبدالرحمٰن پریذیڈنٹ سیکرٹریٹ میں سیکشن آفیسر ہیں
اور انہیں ہم ادیبوں کی میزبانی کے لئے بھیجا گیا تھا —— مرزا
عبدالرحمٰن نے ہمیں ایئرپورٹ جانے کے دعوت نامے اور ڈھاکے کے کارڈ دینے کے بعد
بتایا کہ ۔

صدر پاکستان راولپنڈی سے ڈھاکہ پہنچنے والے ہیں اور ہمیں استقبال

کے لئے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر پہنچنا ہے۔

پارٹی ہاؤس سے کار تیج گاؤں کے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوئی تو سڑکوں
پر دور دور لوگ ہی لوگ۔ پارٹی ہاؤس سے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے تک
ڈھائی تین میل رستے پر لوگ اس طرح قطار اندر قطار کھڑے تھے، جیسے شاہراہ
پر "کروٹن کی باڑھ" کی جگہ انسانوں کی باڑ لگائی گئی ہے۔ نیلی، سبز، سفید
لنگیوں اور رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس مرد اور عورتیں اور بچے . . . . .
ہمارا ڈرائیور بتا رہا تھا۔

—— ان میں سے بہت سے لوگ اطراف کے دیہاتوں سے بھی آئے ہیں۔
یہ سب لوگ اپنے محبوب صدر محمد ایوب خان کو دیکھنے کے لئے بقول ڈرائیور
صبح سویرے سے سڑکوں پر کھڑے تھے —— یوں لگتا تھا جیسے سارا ڈھاکہ
امنڈ کر تیج گاؤں کی سڑک پر جمع ہو گیا ہے —— وہ لوگ صدر ایوب کو
صرف ایک نظر —— ایک جھلک دیکھنے کیلئے صبح سویرے سے
کھڑے تھے —— اور اب دوپہر ہونے کو آئی تھی ——،

مگر ہوائی اڈے پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ صدر ایوب کا طیارہ موسم کی
خرابی کے باعث راستے سے ہی واپس راولپنڈی لوٹ گیا ہے۔ اور آج صدر
ایوب نہیں آئیں گے۔

بات سارے شہر میں پھیل گئی تھی، لیکن لوگ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں
ہوتے تھے —— موٹر کاریں واپس لوٹ رہی تھیں، لیکن لوگ ہر موٹر کار کی
کھڑکیوں پر جھک رہے تھے۔ اس وقت ڈھاکہ کا ہر شخص وہ حسن کا پکا باصفا عاشق
نظر آرہا تھا جو جانتے بوجھتے راہگذر پر بیٹھا ہو، جسے پتہ ہے کہ اس رہگذر سے اس کا محبوب
نہیں گزرے گا۔

محبوب رہگذر سے گزرے، لیکن راہگذر پر بیٹھنا عشق کا اصول جو ٹھہرا ——!!

ابن انشاء خوابوں کا شاعر ہے —— اسے پھر نیند آگئی۔ ہم نے
اُسے سونے کے لئے کمرے میں چھوڑ دیا —— اور ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے
کہ اجنبی شہر میں کہاں جائیں۔ کیا دیکھیں؛ اتنے میں ایک کار آکر رکی۔ اس میں
بندگرام حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری تشریف فرما تھے۔

حفیظ صاحب کو دیکھ کر ہماری سب سے بڑی مشکل حل ہوگئی —— کیونکہ
حفیظ صاحب پہلے بار ڈھاکہ آچکے تھے، اور ہم جو ڈھاکہ دیکھنا چاہتے تھے
وہ ڈھاکہ ہمیں صرف حفیظ صاحب ہی دکھا سکتے ہیں۔

لے حمید صاحب اور میں ان کی کار میں بیٹھ گئے —— اور جب کار گھومتی پھرتی ڈھاکہ
کے فیشن ایبل بازار جناح ایونیو پہنچی تو حفیظ صاحب نے کار رکوا دی، خود
بھی اُترے اور ہمیں بھی اُترنے کو کہا —— اور پھر ہم سے بولے۔

"ڈھاکہ —— اگر اصلی ڈھاکہ دیکھنا چاہتے ہو تو پیدل گھومو
——"

میں سمجھ گیا کہ یہ پیدل گھومنا اصل میں ایک بہانہ ہے۔ اور حفیظ صاحب
اپنی مشہور نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" کی عملی تفسیر پیش کرنا چاہتے ہیں۔
اب حفیظ صاحب کے اِدھر اُدھر کراماً کاتبین فرشتے نہیں تھے، بلکہ
حمید اور میں تھے۔ حفیظ صاحب بتاتے جا رہے تھے۔

"یہ نواب پور روڈ ہے —— نواب پور روڈ کراچی کی ——
بندر روڈ —— یا لاہور کی انارکلی ہے۔

یہ اسلام پورہ ہے —— یہ پٹواٹولی ہے پٹواٹولی کراچی کی
جونا مارکیٹ جیسی ہے —— کپڑوں ہی کی دوکانیں ہی دوکانیں ——
—— اور بازار پرانی بازار کی طرح تنگ اور پیچدار ہیں —— رنگ
برنگی ساڑھیاں اور ڈھاکے کی شہرہ آفاق ململ کے دوپٹے ——!
وہ ڈھاکے کی ململ —— جس کا پورا تھان ایک انگشتری میں سے
نکل جایا کرتا تھا —— وہ ململ جس میں ڈھاکہ کی صنعت پارچہ بافی کا حسن چھپ
کر بھی جھل مل جھل مل کرتا ہے —— وہ ململ جو شہزادیوں کے وقت سے آج تک
ملکاؤں —— رانیوں، مہارانیوں اور بیگمات کے خوابوں کا دھندلکا بنا ہوا ہے
—— وہ ململ جس کے بننے والوں کے انگوٹھے انگریز سامراجیوں نے کاٹ

کاٹ کر پھینک دیئے گئے ـــــ وہ محل نہ صرف تاریخ ہندوستان کے
جھروکوں میں سوار ہے بلکہ آج بھی پٹنا والوں کی دوکانوں پر سوار رہا ہے۔

پٹنا والوں کی پیچدار گلیوں سے ہم باہر نکلے تو سامنے صدر گھاٹ تھا۔ بڑی
گنگا بہہ رہی تھی۔ صدر گھاٹ پر ایک لانچ کھڑا تھا اور بے شمار بادبانی کشتیاں تیر
رہی تھیں۔ مسافر لانچ میں سوار ہو رہے تھے۔ مسافر کشتیوں سے اتر رہے تھے۔
ـــــ افق میں سورج لال بھبھوکا ہو رہا تھا ـــــ اور غروب
ہونے ہی والا تھا۔

صدر گھاٹ پر شور ہی شور تھا ـــــ پھیری والے، خوانچے والے، یکے
اور سنگترے بیچنے والے

سامنے چھوٹی چھوٹی پان سگریٹ کی دکانیں اور چائے کی غلیظ چھوٹی سی ہوٹلیں
ـــــ جن میں بھونپو والے گراموفون بج رہے تھے۔ نور جہاں، لتا منگیشکر،
طلعت محمود اور محمد رفیع کی آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

آ انتظار ہے تیرا . . . تیرے نال پیار ہو گیا، چناں بچی بچی . . .
. . . جیسے پتنگ پیچھے ڈور . . . . تصویر تیری دل میرا . . . . . .
غالب کا ہے انداز بیاں اور،

ان گڈمڈ آوازوں میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ امادہ

چائے پینے کا تھا، مگر سامنے نظر کچے ناریلوں پر پڑی۔ جھنڈا صاحب نے کہا۔
"اگر سچ مچ تازہ دم ہونا چاہتے ہو تو آؤ ـــــ ناریل کا پانی
پئیں"

ایک چھ سات سالہ کالے کلوٹے بنگالی لڑکے نے ان ناریلوں کے سروں
پر بڑی تیزی کے ساتھ خم دار چاقو کے کچوکے مارے اور ایک ایک ناریل
ہمیں اسی طرح تھما دیا، جیسے وہ لیمونیڈ کی بوتلیں ہوں ـــ اور ہم ناریل کا پانی اسی
طرح پینے لگے، جیسے دیہاتی پانی کا مشکیزہ منہ سے لگا لیتے ہوں ـــــ بڑا رسیلا
اور جائفلہ پانی ـــــ ایک ناریل سے سیری نہ ہوتی۔ اور جی اسی بنگالی
لڑکے سے کہہ رہا تھا۔

لائے جا، پلائے جا
جگر میں درد سے لگا،

تازہ دم ہو کر ہم صدر گھاٹ سے اٹھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔
چاروں طرف سے مغرب کی اذانوں کی آوازیں آ رہی تھیں
دعا کو مسجدوں کا شہر ہے۔
ابھی تو نگاہوں کے سامنے پٹنا والوں کی صرف ایک مسجد ہے، لیکن تصور کی
نگاہوں کے سامنے قلعہ کی وہ تاریخی مسجد بھی ہے، جسے اورنگ زیب

کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم نے بنایا تھا۔ اور جس کے دامن میں نواب شائستہ خان کی بیٹی ایران دخت عرف بی بی پاری کا مقبرہ ہے۔

نگاہوں کے سامنے نواب شائستہ خان کی چوک مسجد بیگم بازار کی کرتلب خان مسجد اور شہزادہ اعظم ست گنبد مسجد کے خوبصورت مینار بھی بلند ہیں۔

پرانا ڈھاکہ —— نیا ڈھاکہ —— بنگالی بسنگاڑ رمشاری بازار، ولڈ بنی اشریف، واری، صدری بازار، رمنا، جناح ایونیو بجے کالا کا منڈی، ایڈنگلی کی چرچ، جینی والان، اسٹ فرنڈ ہسپتال، اگر بو تیج بہادر کا سنگت، ڈھاکہ میڈیم بنگشی زبان کا سنڈ —— ایسٹ بینک بلڈنگ، قلعہ لال باغ اور ہوٹل شاہ باغ ہم نیا اور پرانا — دونوں ڈھاکہ گھوم آئے ہیں۔

ذہن کبھی پیچھے سترہویں صدی میں پہنچ جاتا ہے جو ۱۶۰۶ء عیسوی ہے۔

اسلام خان صوبیدار نے ڈھاکہ شہر کی بنیاد رکھی ہے۔ ہندوستان پر شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی حکومت ہے۔ جہانگیر کے زمانے سے ڈھاکہ پہلی بار صوبائی دارالحکومت بنایا گیا ہے۔

تاریخ کے صفحات الٹتے ہیں —— ڈھاکے پہ میر جملہ کی حکومت ہے
پھر نواب شائستہ خان سریر آرائے تخت سلطنت ہے۔ دریائے بوڑھی گنگا میں مگھ لگا کے

کی بادبانی کشتیاں لنگر انداز ہیں۔

مغل، پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور سوداگر ہر قوم اپنے ساتھ ڈھاکے کی ایک تاریخ لائی ہے۔

اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ محمد اعظم بنگالے کا صوبیدار بن کر بہت بڑا لاؤ لشکر لے کر آتا ڈھاکے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے —— شہزادہ محمد اعظم تخت پر بیٹھا ہے اور فضا میں لال باغ قلعہ کے جشن کے نقارے بلند ہو رہے ہیں۔

بازاروں میں ڈھاکہ کی ململ۔ گوٹے ہوئے کپڑے، مرجان موتی اور سیپوں کے کنگن اور کچھوے کے خول بک رہے ہیں۔

تاریخ کے صفحات الٹ رہے ہیں۔

مرکزی حکومت کے تخت پر اورنگ زیب عالمگیر کی جگہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان متمکن ہے اور صوبہ بنگال شہزادہ محمد اعظم کی جگہ ذاکر حسین بنگالے کا صوبیدار ہے۔

قلعہ اورنگ زیب یا لال باغ قلعہ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب ہم ہوٹل شاہ باغ کے جگمگاتے لاؤنج میں کھڑے ہیں۔

سامنے کاؤنٹر پر سپید رنگ کی دھاری سے تنا جسم کی ایک بنگالی دوشیزہ سرخ رنگ کا ببڑ کا اسٹول میں بیٹھی ٹیلیفون پہ جھکی ہوئی ہے۔

یہ دوشیزہ بھی ایک ڈھاکہ ہے

رات بڑھتی جا رہی تھی اور

ع رات ہنس ہنس کے یہ کہتی تھی کہ میخانے میں چل!

اور مشرقی پاکستان جواب دے رہا تھا

ع توڑ بیٹھے اب تو ہم جام سبو

مشرقی پاکستان میں شراب پر پابندی ہے اور حکم یہ ہے کہ

ع پرمٹ بغیر پی نہ سکے کوئی بھی رند

لیکن ہوٹل شاہ باغ مے و مینا و ایاغ سے سجا ہوا تھا۔

رات بڑھتی جا رہی تھی اور ہوٹل شاہ باغ کے جگمگاتے لاؤنج کی رونق بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ سگریٹوں کے دھوئیں کے ہلکے ہلکے سپید بادل، الجھی زلفوں کی کالی گھٹا فضا میں غیر ملکی شرابوں کی تیز چبھتی ہوئی بو

بار کا کاؤنٹر پھیلا ہوا تھا —— کاؤنٹر کے ادھر شیشے کی الماریوں میں مے و مینا و ایاغ جھلک رہے تھے اور کاؤنٹر کے ادھر چشم و ابرو اور زلف لہرا رہی تھی۔

اس وقت جیسے ہوٹل شاہ باغ کے لاؤنج میں ساری دنیا کا حسن سمٹ آیا تھا۔ ملک ملک کا حسن ہوٹل شاہ باغ میں تھا۔ امریکہ کا حسن برطانیہ کا حسن جاپان کا حسن اور مغربی پاکستان کا حسن۔ ہوٹل شاہ باغ کے کمرے خالی ہو گئے تھے اور لاؤنج بھر گیا تھا۔

ایک امریکی

ایک لمبی سرخ امریکی عورت ایک پستہ قد تندرست سانولے پاکستانی سے جھک جھک کر مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔

وہ سرخ رنگ کی جمپو کا ساڑی والی سرخ و سپید بنگالی دوشیزہ —

—— وہ دوشیزہ جو ایک سارڈھا کر ہے۔

وہ شہزادہ لالہ رخ اب ایک انگریز ادھیڑ عمر کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے سرخ سرخ ڈورے پھیل رہے تھے اور جب کسی بات پر کھن کھن کھن قہقہہ لگاتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کرل بالب بھرا ہوا ارغوانی جام چھلک پڑا ہے۔

ان سب سے دور ایک طرف کونے میں ایک نوجوان جاپانی دوشیزہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے رخساروں کا پیلا رنگ۔ ہلکا ہلکا سرخی مائل تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکیلی اور شگفتہ تھیں اور اس نے بند کالر کا سرخ۔ سرخ گلابوں والا سبز رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔

میں نے بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ لڑکی کا حسن بے کھویا ہوا تھا۔ میں ابھی کچھ سمجھ نہ سکا تھا کہ لڑکی کا حسن ابھی مجھ سے آملا اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ لڑکی کا حسن میرے سامنے آکر بیٹھ گیا ——

میں نے اس سے پوچھا۔

"وہاٹ کین آئی ڈو فار یو مائی ڈیرنگ لیڈی ؟"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اور اس نے میرے کوٹ کے کالر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہاٹ از دس ——— ؟"

میرے کوٹ کے کالر پر سبز رنگ کا ایک چوکور بیج SADLE لگا تھا۔ یہ بیج حکومت مشرقی پاکستان کی طرف سے ہر اس شخص کو دیا گیا تھا، جو صدر پاکستان محمد ایوب خان کے تاریخی سفر مشرقی پاکستان کے کارواں میں شامل تھا۔

میں نے اس جاپانی دوشیزہ کو بتانا شروع کیا اور وہ ایک سنہری نوٹ بک اور پنسل لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی! میں بتا رہا تھا۔

"مائی ڈیرنگ لیڈی ——— ! ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ حکومت کا سب سے بڑا حاکم اپنے ملک کے عوام سے ملنے کے لئے ایک تاریخی سفر پر روانہ ہونے والا ہے اس سے پہلے وہ ملک کے ایک حصے مغربی پاکستان کے طول و عرض کا دورہ کر کے وہاں کے لاکھوں، کروڑوں باشندوں سے براہ راست دورے و ملاقاتیں کر چکا ہے اور اب وہ ملک کے دوسرے حصے مشرقی پاکستان کے سارے باشندوں سے فرداً فرداً اور

اور اجتماعاً ملاقاتیں کرے گا۔"

جاپانی دوشیزہ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکن پھر اس نے کہا۔

"ماس کونٹیکٹ (MASSCNTACT)"

یہ طریقہ شاید دنیا کی تاریخ میں پہلا تجربہ ہے۔ ویسے تو انتخابات کے زمانے میں امریکہ کا صدر بھی ایسے دورے کرتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت عارضی ہے۔

پھر اس کے بعد تو گویا وہ گڑیا اپنی نوٹ بک میں لکھتی جا رہی تھی اور میں اسے بالتفصیل بتا رہا تھا کہ:۔

"صدر پاکستان کے اس کارواں کا نام پاک جمہوریت اسپیشل ہے اور یہ پاک جمہوریت اسپیشل ——— موٹرکیڈ، ایئر کنڈیشنڈ اور پانچ کی دو اسپیشل گاڑیوں، ایئر فلوٹیلا اور پی آئی اے کے ہوائی جہازوں پر مشتمل ہے۔ جن کے ذریعے صدر مملکت سارے مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں بسنے والے بھائیوں اور بہنوں سے، باتوں، مسکراہٹوں اور مصافحوں سے ملاقاتیں کریں گے۔"

اور پھر جب آخر میں میں نے اس سے یہ کہا:۔

"القصہ مختصر بس یوں سمجھ کر شمع خود پروانوں کی طرف جا رہی ہے۔"

قدرے شکرسی ڈاکیو کے خندہ چہرے پر شہابی رو پھیل دوڑ گئیں اور وہ شرم سے
سمٹ سی گئی ——— غالباً وہ میری بات نہیں سمجھ سکی تھی اور شاید کسی نے یہ
یہ غلط مفہوم لیا تھا کہ ——— وہ شخص ہے اور میں پہلا ———
کیونکہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی تھی اور اس کا غلط فہمی میں مبتلا
ہونا غلط بھی نہیں تھا۔

دوسری صبح میں علی الصبح اٹھ کر ننگے پاؤں پارٹی ہاؤس کے لان میں ٹہل رہا تھا
پارٹی ہاؤس کے سامنے جانب ایک چھوٹا سا تالاب یا جوہڑ تھا
——— جس میں بہت سے سیاہ فام بنگالی مرد صرف لنگوٹیاں باندھے
ڈبکیاں لگا رہے تھے اور دائیں جانب سڑک کے اس پار ایک جیل جیسی عمارت تھی
پارٹی ہاؤس دراصل کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کو کہلاتا ہے اور پارٹی ہاؤس
کا جیل سے قریبی تعلق ہوتا ہے ——— لیکن چونکہ یہ کمیونسٹ پارٹی
ہاؤس نہیں تھا بلکہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی کا پارٹی ہاؤس تھا اور مشرقی پاکستان
کے سابق سیاستدانوں کا بھی جیل سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے سوچا، یہ
بائیں طرف والی عمارت یقیناً جیل خانہ ہے۔

مگر جب میری نظر اس عمارت کے پھاٹک پر پڑی تو میں نے دیکھا ہمارے
ہمسفر رفیق مرزا عبدالرحمن اس پھاٹک سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے

مذاق میں ان سے پوچھا۔

”مرزا صاحب ——— یہ جیل میں کس سے ملنے گئے
تھے؟“

مرزا صاحب پہلے تو حیران ہوئے اور بولے۔

”بیٹا ——— یہ جیل نہیں ——— بلکہ یہ تو ایک عجیب و غریب مارکٹ
ہے۔ اس کا نام نیو مارکٹ ہے اور اس میں بٹنوں کے بجلی سے
لے کر ریڈیو گرام تک ضرورت کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔
ایسی مارکٹ تو ہر شہر میں ہونی چاہیئے۔ آؤ میں تمہیں وہیں لے چلنے
کے لئے آیا تھا۔“

میں مرزا عبدالرحمن کے ساتھ نیو مارکٹ گیا۔ نیو مارکٹ میرے لئے کوئی
نئی مارکٹ نہیں تھی۔ ایسی مارکیٹیں میں چین کے شہروں ——— پیکنگ، ٹینٹسن،
ہانگ کانگ، مکڈن، کینٹن اور شنگھائی میں دیکھ چکا تھا لیکن ایسی مارکٹوں کی افادیت
سے مجھے بھی انکار نہیں

نیو مارکیٹ ایک گول دائرے میں ارتقا ہے اور سارا بازار مختلف حصوں
میں بٹا ہوا ہے۔ کپڑوں کی دکانیں الگ حصے میں۔ کراکری کی دکانیں ایک
حصے میں۔ اسی طرح فرنیچر، اسٹیشنری، جوتوں، ٹوپیوں، تحفے تحائف کی دکانیں

دور بجر کے سامان کی دوکانیں، میڈیکل اسٹورز، بک شاپس، پوسٹ آفس، تار گھر
—— دائرے کے بیرونی حصے میں سوئی دھاگے سے لے کر ریفریجریٹر تک
ہر چیز ملتی ہے اور جب گاہک تھک جاتا ہے تو اس دائرے کے اندرونی
حصے میں چلا جاتا ہے، جہاں چائے خانے، مٹھائی کی دکانیں، کھانے کی ہوٹلیں
پان بیڑی سگریٹ کے کیبن اور پیشاب خانے ہیں —— !
اب تھکا ہارا گاہک یا تو رس گلا کھائے یا کسی پیشاب خانے میں گھسے
—— یہ بات اس کی ضرورت پر منحصر ہے۔

نیمدگٹ سے ارث آنے کے بعد دیکھا کہ کاریں تیار کھڑی ہیں، اور
ہمیں تیج گاؤں کے ہوائی اڈے جانا ہے، آج صدر ایوب خان بہرحال پہنچنے
والے تھے، انہیں اطلاع بھجوا دی گئی تھی کہ بنگالی عوام سے ان کی محبت کل
سے اب تک ہر گنبد پر باربردی ہوئی ہے، جھٹنے کا نام نہیں لیتی، اور شاید صدر
ایوب نے بھی اس عاشق صادق کی طرح جو آندھی اور طوفان کی پرواہ نہ کرتے
ہوئے اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتا ہے، آج بہر صورت ڈھاکہ پہنچنے کا فیصلہ
کر لیا تھا۔

رستے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے تک نشت ہاتھ پر انسانوں کی گھنی

بارش رکی ہوئی تھی، کل بھی ہم نے یہ بارش دیکھی اور آج بھی ہم وہ بارش دیکھ رہے
تھے۔ آج بارش کل سے زیادہ گھمسان تھی۔ ڈھاکہ کے نواحی دیہاتوں سے جو لوگ
کل نہ پہنچ سکے تھے وہ آج پہنچ گئے تھے۔
ان کے چہروں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ لائے نہیں گئے ہیں
بلکہ خود سے آئے ہیں، کیونکہ پولیس کے ڈنڈے سے ہانکے ہوئے عوام کے چہروں
پر ایسی بشاشت اور شگفتگی ہرگز نہیں ہوتی —— !
تیج گاؤں ہوائی اڈے کے فوجی حصہ کی طرف ہوائی جہازوں کے ہینگر
ہینگرز، رہن شیڈ کے سامنے مشرقی اور مغربی پاکستان کے سارے بڑے
آدمی گورنر ذاکر حسین، لفٹننٹ جنرل اعظم خان، میجر جنرل امراؤ خان، لفٹننٹ
جنرل برکی، سید ذوالفقار علی بھٹو، سید ہاشم رضا، بریگیڈیر ایف آر خان ——
—— قدرت اللہ شہاب، حفیظ جالندھری، ابن انشاء، اے حمید وغیرہ
—— اور ہمارے علاوہ سارے اعلیٰ فوجی شہری حکام، خواتین اور اخبار
نویس صدر ایوب کے طیارے کا انتظار کر رہے تھے۔
سب کی نگاہیں آسمان کے مغربی کنارے پر لگی ہوئی تھیں کہ اچانک ایک
ننھی سی خوبصورت بچی نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔
"وہ —— وہ رہا ہوائی جہاز!"
صدر کا وائیکاؤنٹ طیارہ ایک خوبصورت سفید پرندے کی طرح

اڑتا ہوا آ رہا تھا اس پرندے کی کلغی پاکستان کا سبز ہلالی پرچم تھا ——— کلغی لہرا رہی تھی اور پرندہ زمین کی طرف منہ کئے اڑتا چلا آ رہا تھا

پرندے نے زمین پر ایک چکر لگایا ... ایک بہت بڑے مرغ کی طرح پر پھیلائے زمین پر دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اور پھر وہ ہم سب منتظر نگاہوں کے عین سامنے آکر رک گیا۔

وائیکاونٹ کا دروازہ کھلا۔

مغربی اور مشرقی پاکستان کے سارے اعلیٰ حکام ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ——— اور ہم اخبار نویسوں اور ادیبوں کا جمگھٹ دوڑتا ہوا جہاز کی سیڑھی کے قریب پہنچ گیا۔

جہاز کے اندر سے ایک بلند و بالا جسیم ضخیم سرخ و سپید اور خوش لباس جسم باہر نکلا اور ہوائی اڈے کی ساری نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

یہ اپنا محبوب صدر محمد ایوب خان تھا۔

ایوب خان کا سیدھا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور ایک گرجدار آواز آئی،

”السلام علیکم“!

اس کے بعد ایوب خان سیدھے اخبار نویسوں کی طرف چلے گئے۔ ایوب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور گال سرخ سرخ سیبوں کی طرح دہک رہے تھے۔

رسمی اور غیر رسمی باتیں اور مصافحے ——— اس کے بعد صدر کے باڈی گارڈ کی موٹر سائیکلیں پھٹ پھٹانے لگیں۔ اور پھر جشن کا پیمانہ چھلک گیا تھا

عشق رہگزر سے گزر رہا تھا۔ اور جنونِ عشق چیخ رہا تھا۔

فیلڈ مارشل ایوب ——— زندہ باد

ایوب بھائی ——— زندہ باد

سڑکوں پر ایوب خان کی کار نہیں دوڑ رہی تھی، بلکہ ڈھاکے میں ایک نئی خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ جیسے ایوب خان ڈھاکہ نہیں پہنچا تھا بلکہ کوئی بہت بڑی خوشی ڈھاکہ پہنچی تھی۔

پھر رات ڈھلتی چلی آ رہی تھی، لیکن آج ڈھاکے کی رات کے پاس اندھیرا نہیں تھا۔ سارے ڈھاکہ میں چراغاں ہو رہا تھا۔ سرکاری عمارتیں اور عوام کے گھر بجلی کے قمقموں سے لپ لپ ——— جگمگا رہے تھے۔

یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ کہ ایوب خان آیا ہے یا اجالا آیا ہے!

ہوٹل شاہ باغ کے لاؤنج میں ایک بنگالی شہزادی ”ارشیخ“ آج کل سے زیادہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ وہ بنگالی آمیز اردو میں کہہ رہی تھی۔

”آمی آج ایوب کو دیکھا ——— آج آمی بہت خوش ہے“

اور میں سوچ رہا تھا کہ انسان ——— اس انسان سے کتنا پیار کرتا ہے

جو اندھیرے میں چراغ جلاتا ہے۔

رات کے گیسو کھل کر ایڑیوں تک بکھر گئے تھے، ڈھاکہ اور ڈھاکہ والے
سو رہے تھے مگر سرکاری عمارتوں کے چراغ گھروں کی منڈیروں پر چراغ اور بنگلوں
کے چراغ جاگ رہے تھے۔

ہوٹل شاہ باغ کے پھاٹک سے پارٹی ہاؤس تک سڑک کے بجائے کہکشاں
سی پھیلی ہوئی تھی، ہوٹل شاہ باغ کی شہناز لالہ رخ، نیم غنودگی کے عالم میں تھی
ہوٹل شاہ باغ سے باہر نکلی اور دھیرے دھیرے دبے پاؤں کہکشاں پر
چلتی ہوئی پارٹی ہاؤس کی طرف بڑھنے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی میں خوشی سے پاگل ہو کر بستر سے اٹھا اور میں
نے بڑی بے تابی کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر شہناز لالہ رخ کے بجائے سیاہ فام نور محمد کھڑا تھا۔

پارٹی ہاؤس کا خانساماں ——— سیاہ فام، نیلی لنگی اور چگی داڑھی
والا نور محمد کہہ رہا تھا۔

"صاحب لوگ تم جلدی سے تیار ہو ——— دوسرا سب
صاب لوگ تیار ہو گیا ہے ———"

میں کھسیانا ہو کر مڑا - جن الٹ اور ان کے حمید بھی جاگ پڑے تھے
میری نگاہوں کے سامنے نہ ہوٹل شاہ باغ کی شہناز لالہ رخ تھی اور نہ سیاہ فام نور محمد
کا چہرہ ——— بلکہ اپنا چہرہ تھا جس پر صابن کا بہت سارا جھاگ تھا اور
سیفٹی ریزر چل رہا تھا۔

ہم تیار ہو کر اپنا اسباب سمیٹ کر باہر نکلے تو دیکھا کہ رات بھی اپنا سارا
اندھیرا سمیٹ کر اڑنے کے لئے پر تول رہی ہے اور افق پر صبح کا ستارہ جگمگا
رہا تھا جس میں ابھی ابھی طلوع ہونے والا بارہ گھنٹے لمبا دن سمٹا ہوا تھا۔

ہماری کاروں کا کارواں جب ڈھاکہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اندھیرے
اور اجالے میں آخری معرکہ ہو رہا تھا ——— اور فضا کسی مرمریں جسم والی جوان
لڑکی کی طرح نظر آ رہی تھی جو ابھی غسلخانے سے نہا کر باہر نکلی ہے اور اپنے
جسم کے مرمر کو اپنی سیاہ زلفوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے
اتنے سویرے بھی سنسان اندھیرے میں پلیٹ فارم پر انسانوں کا ایک ہجوم
تھا۔

یہ ہزاروں لوگ اس سورج کو دیکھنے آئے تھے جو ان کی زندگیوں کے گیارہ
سال لمبے اندھیرے میں طلوع ہوا تھا۔

پلیٹ فارم پر دولہن کی طرح سجی ہوئی ایک ریل گاڑی کھڑی تھی، اوپر سے پیلے اور نیچے سے ہرے رنگ کی بالکل نئی ۱۹ بوگیوں پر مشتمل "پاک جمہوریت اسپیشل ٹرین" دیکھنے میں یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی ۱۹ سالہ دولہن پھولوں میں گندھی بسی لپٹی ہوئی ہے ——— اس کی کمر کے نیچے سبز رنگ کا غرارہ پھیلا ہوا ہے۔ اور اس نے سر اور اوپر کے جسم کو چمکیلے زرد رنگ کے بلند و دوپٹے سے چھپا رکھا ہے۔

اس دولہن کے جسم کے سارے حصے، فرسٹ کلاس تھے ——— اور ہمیں بھی ۱۶/۹ نمبر کا فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ دیا گیا تھا ——— اس فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہم چاروں ہمسفر یعنی ملک حمید، ابن انشاء، اور مرزا عبدالرحمٰن پھر اکٹھے ہو گئے تھے۔

ساری فضا میں ہزاروں انسانوں کی آوازیں اکٹھی ہو کر گونجنے لگیں۔

فیلڈ مارشل ایوب ——— زندہ باد

ایوب بھائی ——— زندہ باد

پلیٹ فارم کے افق پر وہی تابناک سورج طلوع ہو رہا تھا جو ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پاکستانی عوام کی زندگیوں کے اندھیروں کو ہمیشہ کے لئے بھگا کر طلوع ہوا تھا۔

میر کارواں جب کارواں کی مہار ہاتھ میں لے لیتا ہے تو کارواں سفر پر چل پڑتا ہے ——— چنانچہ میر کارواں محمد ایوب خان کے ہاتھ میں پاک جمہوریت کا کارواں بھی مشرقی پاکستان کی دوسری منزلوں کی طرف چل پڑا۔

ابھی تک ہم نے کھیتوں اور جنگلوں سمیت مشرقی پاکستان کو صرف ڈائننگ روم کے ائیرکنڈیشنڈ کے پورٹ ہولوں سے دیکھا تھا، لیکن اب ہم ٹرین کی کھڑکی کے چوکھٹے میں سے کھیتوں، جنگلوں اور پہاڑیوں کا مشرقی پاکستان ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا اور جیسے جیسے ٹرین دوڑ رہی تھی، مشرقی پاکستان بھی پھیلتا جا رہا تھا،

ٹیلیفون کے کھمبے، دھان کے کھیت، برساتی پانی کے جوہڑ، اڑتے ہوئے بگلے اور طوطے، آم، کٹھل اور کیلوں کے جھنڈوں میں آدھے چھپے آدھے عیاں دیہاتی کچے پکے چھوٹے گھر، کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے کسان مرد اور عورتیں اور ننگ دھڑنگ پھرتے ہوئے بچے ——— کھیتوں میں چرتی ہوئی بکریاں، گائیں بھینسیں، بیل اور گھوڑا سال۔

گھوڑا سال دراصل ایک ریلوے جنکشن اسٹیشن ہے، ہمارے سفر کی پہلی منزل ——— یہاں بھی انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو خوشی کے مارے گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے

"فیلڈ مارشل ایوب ——— زندہ باد"

لاب اپنے سبز رنگ کے سیلون سے باہر آ گئے ہیں، اب حکومت اور عوام

ایک دوسرے میں مدغم ہیں —— اب تک حکومت اور عوام سیاسی پلیٹ فارم پر ملتے رہے ہیں اور اب ریلوے پلیٹ فارم پر ملتے ہیں۔ اور اب ریلوے پلیٹ فارم پر دولہا حکومت نے براتی کسان کے گلے میں بانہیں ڈال دی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں گھومتا سال کے پلیٹ فارم پر حکومت اور کسان نے پہلی بار ہاتھ سے ہاتھ ملایا ہے۔ ایوب خان کے سفید اور مضبوط ہاتھ میں بنگالی کسان کا سیاہ سخت اور کھردرا ہاتھ ہے —— یہ صرف ایک مصافحہ نہیں ہے بلکہ کسان اور حکومت کے درمیان نئے رشتے کی نئی اور انوٹ کڑی ہے۔

ٹرین گھومتا سال سے آگے بڑھی، اب دیہاتیوں کے ہاتھ گیہوں کی بالیوں کی طرح لہرا رہے ہیں، ایوب خان کا وہ ہاتھ جس نے آٹھ کروڑ انسانوں کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچایا ہے —— اب ٹرین کی کھڑکی کے باہر اس طرح ہل رہا ہے، جس طرح بچے کو تھپکتے وقت ماں کا ہاتھ دھیرے دھیرے ہلتا ہے۔

بنیادی جمہوریت سپیشل اب صرف ایک ٹرین نہیں محسوس ہو رہی ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے یہ نئی زندگی کی نئی لہر ہے، جو مشرقی پاکستان کے شہروں، دیہاتوں، جنگلوں، دریاؤں اور پہاڑوں میں سے ہو کر پھرتی گزر رہی ہے۔

—— یہ ٹرین نہیں بلکہ شہ رگ ہے۔

—— یہ ٹرین نہیں بلکہ نیا لہو ہے جو ریل کی آہنی رگوں کے ذریعے مشرقی پاکستان کے پرانے جسم میں دوڑ رہا ہے۔

—— یہ ٹرین گویا ایک نئی داستان یا سکول مسٹریس ہے جو مشرقی پاکستان کے گاؤں گاؤں میں گھوم پھر کر پاکستانی باشندوں کو نئی زندگی کا نیا درس پڑھاتی جا رہی ہے۔

ا سے اللہ

ب سے بنیادی جمہوریت

پ سے پاکستان

ت سے ترقی

کھیتوں اور جنگلوں یا بازاروں میں بھی لوگ نئی زندگی کی لہر اور نئی زندگی کے رہبر پیارے محمد ایوب خان کو دیکھنے کے لئے ریلوے لائن کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہر جگہ نئی زندگی کے پیارے محمد ایوب خان کی آمد کی خبر پھیل گئی ہے۔ ہر جگہ اسی کا ذکر اسی کا انتظار —— کیا گھر اور بازار۔

اور اب ٹرین بہراب بازار کے سٹیشن پر پہنچی ہے۔

بہراب بازار کے پلیٹ فارم پر ایوب کا ہاتھ سینکڑوں نئے دوست بناتا

چلا جا رہا ہے۔

ایک دیہاتی جس نے ابھی ابھی ایک ہاتھ ملایا ہے۔ وہ خوشی ——
اور حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا ہے اور اسے یقین ہی
نہیں آ رہا ہے کہ یہ کس کا وہی ہاتھ ہے جو صرف ہل کی ہتھی پکڑنے کے لئے بنایا
گیا تھا، اور اب وہی ہاتھ اس ہاتھ سے مس ہو رہا ہے جس ہاتھ نے ملک میں ایک
نئی اور خوشیوں بھری زندگی کا بیج بویا ہے —— !!

پھر شور ہو رہا ہے

تُم زوم جھک جھک چھک

اب ٹرین مشرقی پاکستان کے ایک مشہور اور تاریخی شہر کومیلا کی طرف رواں
دواں ہے۔ کومیلا مشرقی پاکستان کے ڈسٹرکٹ تپرا کا صدر مقام ہے۔ اور دریائے
گومتی کی آغوش میں صدیوں سے آباد ہے۔

اگرچہ میری نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے کھیتوں اور پہاڑیوں پر ہے لیکن میں
جیسے آج سے تین سو سال پیچھے چلا گیا ہوں جن کھیتوں اور پہاڑیوں پر راجہ تپرا
کی حکومت ہے اور زمانہ پندرہویں صدی عیسوی کا ہے۔

راجہ تپرا شہزادوں کے ایک ڈگر فتار ہاتھی پر سوار دریائے گومتی کے
کنارے جا رہا ہے۔ گومتی کے ایک گھاٹ پر مینامتی ریاست کے ایک ماہی گیر کی

اٹھارہ سالہ جوان لڑکی چندرا نہا رہی ہے۔ اچانک راجہ تپرا کی نگاہیں اس
جوان لڑکی کی —— بھنوروں جیسی آنکھوں سے ٹکرا گئی ہیں۔ راجہ تپرا اپنے ہوش و
حواس کھو بیٹھا ہے۔

اور پھر ایسی گیری کی وہ لڑکی چندرا مہارانی بن جاتی ہے اور اس کے اشنان
کے لئے راجہ تپرا کی جنت، ایک میل لمبا تالاب کھدوا دیا ہے۔ وہ تالاب جو آج بھی
دھرم ساگر کے نام سے سیاحوں اور عاشقوں کا پکنک اور لو اسپاٹ
PICNIC & LOVE SPOT بنا ہوا ہے۔

اس تالاب کے پانچ میل بعد مہارانی چندرا کا اپنا گھر ہے —— مینامتی
لال ماٹی —— جہاں ہزاروں کی تعداد میں گوتم بدھ کے چیلے بدھ بھکشو مینامتی
کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے سر گھٹے ہوئے ہیں، پاؤں ننگے ہیں اور سارا جسم
صرف ایک زرد شال میں چھپا ہوا ہے۔

مینامتی کا نام چندرا خاندان کی رانی مینامتی کے نام پر رکھا گیا ہے ——
لیکن اب مینامتی کا گاؤں بدھ بھکشوؤں اور بدھ مت کے گھر گاؤں سے ملے
مشہور ہے۔

راجہ تپرا اور رانی مینامتی —— میں اور جوگی شاہ باغ کی شہنازِ لالہ رخ تھا

۱۹۳۹ء میں جیسے ساحر کیوں مانگ اس دنیا سے گھڑا تھا اور اب ۱۹۶۰ء

میں پاکستانی سیاح ابراہیم جلیس اس راہگذر سے گذر رہا ہے —— راہگذر
امکان کی جو سمت صرف مسافر بدلتے رہتے ہیں۔

پرانی اور نئی تاریخ کے گوشے ملتے ہیں، مل کر پھر ایک دوسرے سے جدا ہو رہے
ہیں۔ تصویر پھر سنہ ۱۹۶۰ء کے کومیلا کی طرف لوٹ رہا ہے اور پاک جمہوریت
اسپیشل ٹرین کومیلا شہر کے اسٹیشن کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ آدمی کی سفید عمارتیں
کارخانے، دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں اور بجلی کے اونچے اونچے مینار۔

مرد، عورتیں اور بچے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پلیٹ فارم کے کنارے
جمع ہو گئے ہیں۔ کومیلا کے باشندوں میں ایوب خان کے لئے بڑا جوش و خروش ہے
کیونکہ ایوب خان کومیلا کے باشندوں کے لئے کوئی نیا مہمان نہیں ہے۔ وہ
کومیلا والوں کا پرانا دوست ہے۔

اب سے چند سال پہلے ایوب خان جب مشرقی پاکستان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ
تھے انہوں نے سارے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد کومیلا شہر کو اہم فوجی مرکز
کا اعزاز عطا کیا تھا اور ایوب خان ہی کے ہاتھوں کومیلا چھاؤنی کی بنیاد پڑی تھی۔

ایوب نے کومیلا کو یہ فوجی اعزاز عطا کیا تھا اس کے عوض اب کومیلا
والے ایوب کے عمر و اقبال کی درازی کے لئے ہیپ ہیپ کر رہے تھے
اور ایوب کی نظریں بھی اپنے پرانے دوستوں کے جانے پہچانے چہروں کو تلاش کر

رہی تھیں۔

ایوب جو پہلے کومیلا کو ایک فوجی اعزاز عطا کر گیا تھا، اب کومیلا والوں
کے لئے بنیادی جمہوریت کا خوبصورت تحفہ لے کر آیا تھا۔

کومیلا کے عوام بہت خوش ہیں۔ ایوب کا کارواں کومیلا سے آگے بڑھ رہا ہے
لیکن کومیلا والے نعرے مارتے، گرتے پڑتے، ہنستے مسکراتے ٹرین کے ساتھ بھاگے جا رہے
ہیں۔

اب ٹرین نواکھالی کے میدانوں سے گذر رہی ہے۔ نواکھالی جو ہندوستان کی
تقسیم کے وقت تاریخ کے صفحات پر پہلی بار ابھرا تھا —— اور جہاں سیاست
اور مذہب میں تیسرے نعروں کا معرکہ ہوا تھا جہاں آج سے ٹھیک
گیارہ سال پہلے خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں۔

ٹرین نواکھالی کے مقام لاکسام کے جنکشن پر رکی ہے۔

یعنی مشرقی پاکستان کی صنعت پارچہ بافی کا ایک اہم مرکز ہے۔ ہینڈ لوم
انڈسٹری کے لئے یہ سارے برصغیر پاک و ہند میں مشہور ہے۔

پلیٹ فارم پر ان بھکاریوں کا ہجوم تھا جو پاکستان سے پہلے جولاہے ہوا کرتے
تھے، ان میں وہ دستکار بھی تھے جن کے انہیں جولاہوں کے انگوٹھے انگریز سامراجیوں نے
گاجروں اور مولیوں کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینک دیئے تھے۔

اب وہی دستکار ہاتھ ایوب خان کے ہاتھ میں تھا اور یہ مصافحہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ نہیں کہ ایک دستکار کا ہاتھ ایوب کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ مشرقی پاکستان کی صنعتِ پارچہ بافی ایوب خان کی حفاظت میں آگئی ہے۔ یا ایوب نے بذاتِ خود آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے مشرقی پاکستان کی صنعتِ پارچہ بافی کو نیا سہارا دیا ہے۔

ٹرین تیزی سے مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے بندرگاہ چٹاگانگ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

سہ پہر ڈھل رہی ہے۔ میں ٹرین کے ڈائننگ کار میں بیٹھا شام کی چائے پی رہا ہوں سیتا کنڈ کا اسٹیشن ابھی ابھی پیچھے گزر گیا ہے۔

میری نظریں مغربی پہاڑیوں کی چوٹیوں پہ چندرا ناتھ اور شمبو ناتھ کے مندروں کو تلاش کر رہی ہیں۔ کتابوں میں پڑھا ہے کہ سیتا کنڈ کے نواح میں مشرقی پاکستان کی سب سے اونچی پہاڑی ہے یعنی ڈھائی ہزار فٹ اونچی پہاڑی۔

انہیں پہاڑیوں میں کہیں وہ مندر بھی ضرور ہوگا جس میں گوتم بدھ کے ایک پاؤں کے نشان کو محفوظ کر لیا گیا ہے ——!

سیتا کنڈ کے نام کے ساتھ ہی ذہنی سطح پہ ہیون سانگ مجھے صدیوں پیچھے لے گیا ہے۔ ان پہاڑیوں میں رام چندر جی بن باس کی زندگی گزار رہے تھا

اور ادھر جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک خوبصورت عورت کا جسم ہر کس سے بے نیاز ایک چشمے میں نہا رہا ہے۔

ہیون سانگ مجھے بتا رہا ہے —— "یہ سیتا دیوی ہے۔ ہندوستانی عورت کی وفا —— اور خود اس چشمے میں سیتا کے اشنان کے باعث بھی اس آبادی کو سیتا کنڈ کہا جاتا ہے ——"

ہیون سانگ کہہ رہا ہے —— "چلو اب رام چندر جی سے ملیں" مگر ابنِ انشا کہہ رہا ہے۔

"چلو اٹھو —— چٹاگانگ سٹیشن آگیا ہے۔"

چٹاگانگ کا ریلوے اسٹیشن بے شمار سبز ہلالی پرچموں کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ اس کے سروں پر جھالروں کے سہرے بندھے تھے، اور گلی کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے قمقموں کی مالائیں اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔ اور کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہاتھوں میں پھول لئے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔

پاک جمہوریت اسپیشل بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ اسٹیشن میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ پورا چٹاگانگ خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔

فیلڈ مارشل ایوب —— زندہ باد

ہمارا پیارا پریزیڈنٹ —— پائندہ باد

پاکستانی عوام کا محبوب —— ایوب —— اپنے سبز رنگ کے

کیبن سے باہر بکھرا ترپ نظر آیا، جیسے آسمان سے چنبیلی اور گلاب کے پھولوں کا مینہ برس رہا ہے۔

وزارت اطلاعات کے جوائنٹ سیکریٹری مسٹر شیلے کے قریشی نے جو اس تاریخی ریل گاڑی میں ہم سب کے میزبان تھے ایسا پروگرام بنایا کہ رات ہمارا قیام اسی ٹرین میں رہے گا۔ اور صبح ہم موٹر کاروں کے ذریعہ مشرقی پاکستان کے سرینگر اور جینتا ——— رانگاماٹی اور کپتائی جائیں گے۔ رات آپ لوگ اپنی مرضی سے چٹاگانگ میں جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں۔

لیجئے چٹاگانگ کی رات ——— !

بنگلہ زبان کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی کہانیوں اور گیتوں میں چٹاگانگ کی رات کے حسن سے بارہا لطف اندوز ہو چکا تھا، لیکن آج رات ——— چٹاگانگ کی رات عین نگاہوں کے سامنے تھی اور اس کی زلفیں میرے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے اپنے ساتھیوں ابن انشا اور لطیف سے کہا۔

"آؤ یارو ——— آج "دوشیزۂ شب" کے ہمراہ چٹاگانگ کی جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر کھلے پھریں"

چٹاگانگ کی شہری زندگی ڈھاکہ کی شہری زندگی سے مختلف نہیں ہے ویسی ہی دکانیں، ویسی ہی کھڑکی رکشائیں، وہی تنگ گلیوں میں بسیں، وہی کنول کے پھولوں جیسی بڑی بڑی آنکھوں والی نمکین سانولی عورتیں اور ان کی تیل چپکیلی کمر تک بل کھاتی ہوئی سیاہ چمکیلی زلفیں ——— وہی سانولے اور سیاہ فام مرد، پتلونیں، پاجامے اور لنگیاں،

فٹ پاتھوں پر ناریل کا پانی، کیلے اور سانچی پان۔ بیچا اور ممبر کی آڑ کر لیا بیسے اور رس گلے ......

دو تین گھنٹوں تک پیدل گھومتے رہے جب پیروں کی نسیں کھنچنے لگیں تو ابن انشا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے رشک آمیز خوشی آمیز لہجے میں اطلاع دی کہ

"ایئر ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس پیغام آگیا ہے اب "سیف لینڈنگ""

کہ پوری کار خالی ہے ——— چلو ——— جلدی لوٹ چلو"

پھر پاک جمہوریت اسپیشل کی یہ نرم گرم سی آغوش تھی اور ہم تھے اور

نیند کی پریاں ہماری آنکھوں کے جھروکوں سے جھانک رہی تھیں۔

صبح سویرے ہم سب سے پہلے چٹاگانگ گورنمنٹ ہاؤس میں تھے اور

غیر ملکی اخبار نویسوں کے ساتھ ایک مختصر سی دلچسپ، چٹ پٹی سی گپ شپ ہوئی اور

اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس ہی سے کاروں کا کارواں مشرقی پاکستان کے سرسبز

اور جنگلوں ——— رانگاماٹی اور کپتائی روانہ ہو گیا۔

پکے پکے پہاڑی راستوں (ہل ٹریکس) پر کاروں کا کارواں رواں دواں تھا

دونوں طرف پہاڑیوں پر سبز کے گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ یہ گھنے جنگل ہاتھیوں

چیتوں اور رائل بنگال ٹائیگروں کی اقلیم ہیں اور شکاریوں کے خوابوں کے جنگل

ہیں۔

ان جنگلوں میں دور دور اکا دکا ایک ایک کڑی کا الگ تھلگ مکان

نظر آتا ہے۔ جن میں مشرقی پاکستان کے پہاڑی قبیلوں مگ، بیرانگ اور

چکمہ قبیلوں کا ایک ایک خاندان آباد ہے۔ یہ قبائلی لوگ اکٹھے ایک گاؤں

کی شکل میں نہیں رہتے بلکہ ہر مکان ایک دوسرے سے ایک دو میل دور ہوتا

ہے۔ سانپوں اور زہریلے جنگلی کیڑوں کے ڈر سے کڑی کے اونچے اونچے پلیٹ فارم

بنائے جاتے ہیں اور ان پلیٹ فارموں پر لکڑی اور بمبو کی ٹکونی چھتوں کے

مکان کھڑے کئے جاتے ہیں۔ ان مکانات پر بڑی وحشت برستی ہے ———

اور اس تصور ہی سے ڈر لگتا ہے کہ انسان ایسے گھنے جنگل میں ایسے الگ تھلگ

گھر میں زندگی بسر کر سکتا ہے ——— چرچر کرتا ہوا بھیانک جنگل، نہ بجلی کی روشنی

اور نہ لالٹین اور نہ کوئی پڑوسی ......

دیکھنے میں یوں نظر آتا ہے، جیسے دنیا کا ابتدائی دور ہے۔ حضرت آدم

اور اماں حوا کو رخصت ہوئے ایک صدی بھی نہیں گزری ہے ——— اور

انسان ابھی پتھروں اور دھاتوں کے دور کا انسان ہے۔

کار کی کھڑکی سے باہر ایک عورت اور ایک مرد پہاڑی پگڈنڈی پر

چڑھ رہے ہیں ——— مرد کے کمر میں صرف ایک لنگوٹی ہے اور عورت نے

اپنا زیریں جسم ناف سے گھٹنوں تک ایک رنگین کپڑے سے ڈھانک رکھا ہے

اور اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہے۔

اگر ہماری کاروں کا کارواں تہذیب ہے تو پھر یہ تہذیب ابھی تک

ان پہاڑی باشندوں تک نہیں پہنچی ہے۔ البتہ ان کے قریب سے گزر رہی ہے

جس طرح اب ہماری کاروں کا کارواں چکمہ قبیلے کی اس نیم عریاں عورت اور

مرد کے قریب سے گزر رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کے محکمہ اطلاعات کا ایک "چھوٹا بابو" ہماری کار میں ہے

—— اور ہمیں بتا رہا ہے

"ان پہاڑی جنگل انسانوں کے تین بڑے قبیلے ہیں —— ماگ، مورانگ اور چکمہ —— چکمہ ان سب سے بڑا قبیلہ ہے اور ماگ قبیلہ اس لئے مشہور ہے کہ اس کی سردار ایک عورت ہوتی ہے"

اس انکشاف کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے ایک رنگین عورت کا چہرہ آجاتا ہے، جس نے اپنے سر میں کبوتروں اور موروں کے پروں کا تاج پہن رکھا ہے اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ ناک اور کانوں کے —— سوراخوں میں پیتل کی موٹی بڑی جھریاں پڑی ہوئی ہیں، گلے میں سفید، سرخ، اور سبز کوڑیوں کی ایک مالا ہے اور ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا۔

یہ ماگ قبیلے کی سردارنی ہے، یہ صرف سردارنی ہی نہیں بلکہ بڑی جادوگرنی بھی ہے۔

ان جنگلوں میں پہنچ کر یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہم چٹاگانگ کے رانگا ماٹی نہیں جا رہے ہیں بلکہ بیسویں صدی سے آٹھ ہزار سال قبل مسیح کے دور کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ چکمہ قبیلے کی عورت اور ماما جاتی کی تیسری نسل کی ایک وحشی عورت میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا ہے —— یہ بھی نیم عریاں اور تہذیب سے

دور ہے اور وہ بھی نیم عریاں اور تہذیب سے دور۔

چکمہ قبیلے کی یہ نیم عریاں دوشیزہ اور کرنافلی کا ملٹی پرپز پراجیکٹ!!

مشرقی پاکستان کے محکمہ اطلاعات کا چھوٹا بابو" ہمیں بتا رہا ہے کہ صدر ایوب رانگا ماٹی اس لئے جا رہے ہیں کہ رانگا ماٹی سے تین میل دور ایک نئے رانگا ماٹی کی بنیاد رکھیں۔ میں پوچھ رہا ہوں۔

"پھر پرانے رانگا ماٹی کا کیا ہوگا —— ؟"

چھوٹا بابو کہہ رہا ہے۔

"پرانا رانگا ماٹی دریائے کرنافلی میں ڈوب جائے گا۔"

اگلے سال ۱۹۶۱ء میں ملٹی پرپز پراجیکٹ کی تیاری کے بعد یعنی جب کرنافلی سے بجلی حاصل کرنے کے بعد اس کا رخ پرانے یعنی موجودہ رانگا ماٹی کی طرف پھیر دیا جائے گا اور دریائے کرنافلی پرانے یعنی موجودہ رانگا ماٹی کے خالی اور ویران گھروں کو ہمیشہ کے لئے ہڑپ کر جائے گا۔

رانگا ماٹی کے سرکٹ ہاؤس کے لان میں صدر ایوب علی اور خیر علی اسفند فرزند کے ساتھ چکمہ قبیلے کی دوشیزاؤں کا وحشی ناچ دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔

اور سرکٹ ہاؤس کے نیچے اونچے نیچے ٹیلوں پر زندہ دل نوجوان اور

رنگین مزاج اخبار نویس چکمہ قبیلے کی جوان لڑکیوں کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہے
ہیں اور یوں نظر آ رہا ہے جیسے فوٹوگرافر ایک وحشی انسان اور ایک مہذب
انسان کی تصویریں نہیں کھینچ رہے ہیں بلکہ عہد حجر قدیم اور عہد حاضر کو اکٹھا کر
رہے ہیں۔

اب ہم پرانے رانگاماٹی اگلے سال زیر آب ہو جانے والے رانگاماٹی سے
تین میل دور ایک بے بجائے میدان میں ہیں، بیچ میں شامیانہ تنا ہوا ہے،
جس میں صدر ایوب ایک اونچی پشت والی زریں کرسی پر متمکن ہیں اور رانگاماٹی کا
قبائلی سردار کیپٹن تری دیپ رائے اطلس کی زریں شیروانی اور تنگ سری
کے سفید چست پاجامے میں ملبوس کھڑا ہے، اس کے سر پر پگڑی اور پگڑی میں
امتیازی نشان، ایک چاندی کا سا پر لگا ہوا ہے اور اس کی کمر سے ایک زریں نیام والی
خمیدہ تلوار لٹک رہی ہے۔

کلکتہ کا ہندوستانی اخبار نویس مسٹر ریسن آف امرت بازار پتریکا مجھے بتا رہا
ہے کیپٹن تری دیپ رائے کی تعلیم انگلستان میں ہوئی ہے —— اس کی ماں
ایک فرانسیسی عورت تھی اور باپ مشرقی پاکستان کے پہاڑی علاقے کا قبائلی سردار
—— مسٹر ریسن کا یہ انکشاف میری دلچسپی کا باعث ہے کہ ہندوستان
کی مشہور رقاصہ اور فلم ایکٹریس سادھنا بوس بھی کیپٹن تری دیپ رائے کی رشتہ دار

ہے اور وہ کیپٹن تری دیپ کی شادی میں رقص کرنے کے لئے کلکتہ سے رانگاماٹی میں
آئی ہوئی ہے۔

صدر ایوب نے —— نئے رانگاماٹی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اب
ہماری کاروں کا کارواں مشرقی پاکستان کے جنیوا، زیرِ تعمیر —— کپتائی کی
طرف بڑھ رہا ہے۔

کپتائی جہاں کرنافلی ملٹی پرپز پراجیکٹ ہے، اونچی نیچی پہاڑیوں پر دریائے
کرنافلی کی آغوش میں خوبصورت سفید بنگلوں سے پھیلا ہوا ایک چھوٹا سا نیا پارک
شہر واقع ہے، یہاں سینکڑوں کی تعداد میں امریکی باشندے آباد ہیں، ان کے
پاس جیپ گاڑیاں اور شیورلٹ کاریں ہیں۔ کھڑکیوں میں ایئر کنڈیشنگ کے یونٹ
لگے ہوئے ہیں۔ وسط میں ایک چھوٹا سا سینما ہال ہے جس کے باہر نوجوان امریکی
لڑکیاں اور لڑکے نیکریں اور جینز اور کاؤبوائے ٹائپ تنگ پتلونیں پہنے
ٹکٹ کی کھڑکی کے کھلنے کے انتظار میں چیونگ گم چبا رہے ہیں اور لکی اسٹرائیک
کی تیز سگریٹیں پھونک رہے ہیں۔

سامنے ایک سیاہ سکوٹر پر سرخ بالوں والی نازک اندام جوان لڑکی بڑی چھوٹی
سی نیکر پہنے بیٹھی ہے —— اور اس کا نوجوان شوہر سکوٹر چلا رہا ہے۔
شوہر کی سیاہ پیٹھ اس کی مرمریں سرخ رانوں میں پھنسی ہوئی ہے اور سامنے

۸۰ ملین ڈالر کا کرنالی ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ پھیلا ہوا ہے۔

ایک امریکن انجینئر ہمیں بتا رہا ہے۔

دریائے کرنالی پر جو بند باندھا جائے گا وہ ۸۳۴ فٹ اونچا ہوگا۔

جو ۷۰۲ مربع میل وسیع اور ۰۰ فٹ گہری ایک جھیل بنا دے گا، جس سے ابتداً

روزانہ اسی ہزار کلوواٹ بجلی حاصل کی جائے گی۔

کان امریکن انجینئر کی طرف لگے ہوئے ہیں اور نگاہیں سیاہ شرپا پر جمی ہوئی

آدھے سب بدن پر لگی ہیں

پس منظر میں دور ایک پہاڑی کے دامن میں جکرہ قبیلے کے کسی جادوگر کا الگ

تھلگ بانس کا مکان ہے اور سامنے سیمنٹ کا ایک خوبصورت بنگلہ ——— !

وہ جکرہ بھی انسان ہے ——— اور یہ امریکن بھی انسان ہے۔ جکرہ

بھی جنگل میں رہتا ہے اور امریکن بھی جنگل میں رہتا ہے لیکن اس بانس کے

مکان اور اس ایئرکنڈیشنڈ بنگلے میں چند فرلانگ کی مسافت کے باوجود صدیوں اور

زمانوں کی دوری ہے۔ امریکن جنگل میں منگل منا رہا ہے۔ اور جکرہ کا جنگل بھی جنگل ہے

بریگیڈیئر ریاض احمد خان کی صلاح ہے کہ سہ پہر ہو رہی ہے۔ شام کی چائے

پینے کے بعد ہمیں پھر چٹا گمگ ریسٹ ہاؤس چلنا ہے، شام کی چائے تک ذرا

شعر و شاعری ہو جائے۔

کرنالی کا ڈاک بنگلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ہے۔ اس کے ساتھ

ہی ایک پرفضا جھیل ہے اور ہم سب ڈاک بنگلے کے برآمدے میں جمع ہیں۔

اس پرفضا اور جنت نظیر مقام پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی عمر چالیس سال

کم ہو گئی ہے۔ اور وہ ایک ۳۰ سالہ نوجوان کی طرح لہک لہک کر گا رہے ہیں

نگار ہائے فتنہ گر — کوئی ادھر کوئی ادھر

ابھارتی ہیں عیش پر — تو کیا کرے کوئی بشر

چلو جی قصہ مختصر

تمہارا نقطۂ نظر

درست ہے تو ہو مگر

ابھی تو میں جوان ہوں

حفیظ صاحب کا دعویٰ شباب ختم ہو چکا ہے تو اپنا بانکا البیلا شاعر جمیل الدین

عالی پورے زور اور ترنگ میں اونچی آواز میں گانے لگتا ہے۔ اگرچہ سامنے سرخ بالوں اور مکھن

جیسے جسم والی سات سمندر پار کی وہ شہزادی اپنے سیاہ شرپا کو رجھا رہی ہے ——

لیکن عالی گا رہا ہے۔

باتیں بہت حسین عالی کی اپنی بولی بانی

جس نے بنگلہ نار نہ دیکھی وہ نہیں پاکستانی

ہرے بھرے لوکا دوہے گھنے سے بنگال   گیت کنارے وہ ہی لڑیاں بکھرائی

چیچے ناچیں ڈھب کے پیڑ اور آگے پان بہاری
انہیں ناچوں کی تھاپ پہ ابھرے ساری بنگلہ نگری

اب کاروں کا کارواں پھر چٹاگانگ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ شام کے
کالے پر دھرتی پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص جیسے عالی کی بنگلہ نظم کے تصور میں
کھویا ہوا ہے ——— اور مغربی پاکستان سے آنے والے ہم
نوجوان سیاستدانوں کی آہیں عالی کے اس دوہے میں گھلتی جا رہی ہیں۔

ہم بچھیم پیلاں ہیں ناگن آنے جانے والے
کب ہو سکے آنے جانے والے روگ شانتی والے

اچانک قریب کے جنگل سے ایک رائل بنگال ٹائیگر کے دھاڑنے کی آواز
آتی ہے۔ سب کے سب یکبارگی ڈر جاتے ہیں۔ اگلی کاروں کے تمام شیشے چڑھے
ہوئے ہیں اس لئے سب مطمئن ہیں اور دھاڑ پر سوچ کر اس رائل بنگال ٹائیگر کو بھی
چٹاگانگ ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔ جناب چوہدری غلام عباس ٹائیگر کو دعوت
دیا ہوں۔ ——— اے شیر چل چٹاگانگ چل
پھر کورس شروع ہوتا ہے
ایسے کہ جہاں کا آخر چل ——— کہ خدمت اسلام چل
اے شیر چل چٹاگام چل

ادھر اندھیرے جنگل میں رائل بنگال ٹائیگر دھاڑ رہے ہیں اور ادھر دوسری
سمت اپنی جگہوں کی روشنیوں کشما کی سب سے بڑی کاغذ سازی کی مل کرنافلی
پیپر مل واقع ہے۔ جو ہر سال مختلف قسم کا ۲۰ ہزار ٹن کاغذ پیدا کرتی ہے۔
خیر تو چٹاگانگ یونہی چل رہا ہے۔ البتہ ہماری کاروں کا کارواں چٹاگانگ مسلسل
طرف تیزی سے چل رہا ہے۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا ہے۔ جنگل جھینگروں سے
بھر رہا ہے ہیں اور چٹاگانگ کی خوبصورت آبادی اپنی بجلی کی آنکھیں جھپک جھپک
کر ہماری کاروں کے آنے والے کارواں کو دیکھ رہی ہے

اے چٹاگانگ کی وہ پرفسوں رات!

چٹاگانگ کی دوسری رات بھی بڑی حسین تھی۔ اور وہ اپنی کالی چمکیلی چوٹی
کے بال کھولے نہانے کے لئے اندھیرے کے چشمے کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اتر
رہی تھی اور میں اپنے کمپارٹمنٹ کے غسلخانے میں نہا رہا تھا اور حیدر سلطان شاہ
غسلخانے کے دروازے کو بجا بجا کر چیخ رہے تھے۔

"جلدی نکلو ——— دیر ہو رہی ہے۔ میزبان آ چکے ہیں اور
عالی کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں"

میزبان ——— میزبان دراصل جمیل الزماں عالی کے تھے۔ ہم سب تو بدی
کے مہمان تھے ——— لیکن عالی دعوتوں کے معاملے میں بڑا "جمہوری مزاج
اور مسلمان" واقع ہوا ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں بھی وہ "انفرادیت" کا قائل

قائل نہیں اور ایسے موقعوں پر وہ یہی کہتا ہے۔ ع

فردِ قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں،

چنانچہ اس نے اپنے میزبان سے بھی یہی کہا تھا۔

"دعوت بھی "باجماعت" ہوگی"

میزبان بھی خالص مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اور عالی باجماعت میں حضرت قدرت اللہ شہاب، ابوالاثر حفیظ جالندھری، ابنِ انشاء اور سعید اور مجھے ساتھ لے کر میزبان کے ہمراہ دعوت گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

پہلے تو ہم نے یہ سوچا کہ کوئی "ڈنر ڈانس" کا پروگرام ہے، لیکن دعوت گاہ پہنچ کر پتہ چلا کہ "ڈنر مشاعرہ" کا پروگرام ہے۔

ہمارے میزبان چٹاگانگ کی ایک جوٹ مل کے مالک جناب جمیل تھے۔ —— خاصے دولت مند آدمی اور چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ایک خوبصورت اور دل فریب کوٹھی کے مالک —— شاعری، ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دلچسپی خاصی حیرت کا باعث تھی۔

کہاں جوٹ مل اور کہاں دیوانِ غالب!

پٹ سن کے ریشے اور قدرت اللہ شہاب کے فلسفے

گلشن ظہیر اور ابنِ انشاء کے سانیٹ!!

ایک بجے شب مشاعرے کے بعد محفلِ مشاعرہ کا آغاز تھا، نہایت مختصر سی بڑی خوبصورت محفل تھی، باذوق اور خوش لباس مرد اور خوش لباس اور خوب رو خواتین۔

اچھے شعر اور اچھے راگ۔

چٹاگانگ کی رات بھی خود فراموشی کے عالم میں حالی کے دوہے اور اقبال کی نظمیں سننے میں محو تھی۔ حتیٰ کہ ایک سبز رنگ اور کنول کے پھول جیسی بڑی بڑی آنکھوں والی خاتون نے شعر کی داد دینے کے بجائے جمائی لینے کے لئے منہ کھولا اور حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے وہ غزل چھیڑی جس کا آخری شعر یہ تھا۔

ع افسوس مجھے نیند آتی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے

حفیظ صاحب کا یہ اعلان ہی اعلانِ اختتامِ مشاعرہ تھا۔ ہم سب اس رنگین محفل سے باہر نکلے تو دیکھا کہ چٹاگانگ کی رات کرے جگی زمین پر آ جانے کے پھول دھند رہی تھی۔

دوسرے دن صبح چٹاگانگ آفیسرز کلب میں جشنِ چٹاگانگ۔ وائٹ مگ کا ایک کامیاب جلسہ تھا، اس جلسے میں اپنے ہم وطن کے ایک دوست شرف محمد عزیز سے مل کر بہت خوشی ہوئی، اعجاز عزیز حیدرآباد دکن مرحوم کے ایک بیت

بڑے نواب کے سجے ہوئے ہیں اور چٹاگانگ کی بندرگاہ" پر بیٹھی پرشکوہ شان
ہیں۔ مجھے چٹاگانگ کی بندرگاہ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور ہمت عزیز اس شوق
کی پذیرائی کے لئے بہترین ذریعہ تھے۔ یہاں ابن انشا۔ اور حمید پیچھے سے ہمت
عزیز صاحب کی کار میں کمک تھے اور ان کے ساتھ چٹاگانگ کی عظیم
بندرگاہ کی خوب جی بھر کی سیر کی۔ اس وقت ڈیک پر رنگون سے آیا ہوا
ایک مسافر جہاز لنگر انداز تھا۔ رنگ برنگی لنگیوں میں ملبوس سیاہ چہرے
ہاتھوں میں لئے بہت سے مسافر رنگون سے آئے ہوئے تھے ——
ہمت عزیز ہمیں بتا رہے تھے۔

یہاں سے رنگون بہت قریب ہے صرف چھ گھنٹے کا سفر
ہے!

رنگون کے نام سے میرے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی ـــ

رنگون کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ہائے ہائے —— رنگون کا وہ اسٹرینڈ ہوٹل!

۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کی وہ رات —— وہ میری الہڑ جوان بڑی حسینہ بیوی کی
اور وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریائے رنگون۔

وہ پیپر ہیں چٹاگانگ گورنمنٹ اور ہیں صدر محمد ایوب خان کا۔ وہ دربار
جہانگیری" آراستہ تھا تصوروں کی آنکھوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سولہویں
صدی عیسوی کا دور ہے۔ نورالدین جہانگیر سر پہ تاج لئے تخت ہندوستان پہ
اور بہت سے زیادہ شاہی محل کا گھنٹہ بجا رہے ہیں اور محل کے آگے محراب
پر جہانگیر کھڑا ہے اور گرجدار آواز میں پوچھ رہا ہے۔

"فریادی —— تمہیں کیا تکلیف پہنچی ہے؟"

لیکن جب فریادی آدھی بنگلہ، اور آدھی اردو اور آدھی انگریزی میں
اپنی تکلیف بیان کرنے لگا ہے کہ

"ہمارے پیارے پریسیڈنٹ —— ہمارے پیارے منسٹر،
رحم ہے جو اس سے کوئی بہت کشش ہے بس اب آپ
آنا تربیل کر دو کہ کرنا فیر کا نیت کر دو ——"

تو پھر نگاہوں کے سامنے جہانگیر کی جگہ ایوب کا نام نظر آتا تھا۔

ایوب کے یہ سوال جواب کے جلسے جہانگیر کے عادل دربار سے کسی
طرح کم نہیں ہیں۔ ان جلسوں میں بغیر کسی خوف اور ڈر کے عوام اپنے حاکم سے
ہر قسم کا سوال پوچھتے ہیں —— ایسے سوال بھی جن کو سن کر پرانے حاکموں کا
غیظ و غضب ایک دم بھر آتا تھا۔ لیکن ایوب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے

ایوب ہر سوال کا جواب دے رہا ہے یہ نظر آرہا ہے ایسے
حاکم اور محکوم ایک دوسرے کے آمنے سامنے نہیں ہیں بلکہ بہت سے چھوٹے
بھائی اپنے بڑے بھائی سے والد مرحوم کی دولت اور جائیداد کا حساب پوچھ رہے
ہیں۔ اور ایوب خالص پٹھانی اردو میں ان سے کہہ رہا ہے
”آپ لوگ جو پوچھنا چاہتے بغیر کسی ڈر کے پوچھ سکتے ہو
ہمارا دل بالکل خفا نہیں ہوتا۔“
بہت سی کام کی باتیں اور کچھ ہنسی دل لگی کی باتیں ہوئیں۔ اب ایوب اپنے
چٹاگانگ کے بھائی بہنوں کو الوداع کہہ رہا ہے۔

ہم سب چٹاگانگ کے ہوائی اڈے، چٹاگانگ ایئرپورٹ کی عمارت کے سامنے
کھڑے ہیں اور ہمارے سامنے صدر کے ہوائی کاونٹ طیارے کے علاوہ دو
اور ڈکوٹہ طیارے بھی کھڑے ہیں۔
یہ تینوں طیارے: دوسری پاک جمہوریت اسپیشل ہیں۔
صدر کا طیارہ اڑ گیا ہے اور ہم سب اپنے اپنے طیاروں کی طرف دوڑ رہے
ہیں۔ اگلے ڈکوٹہ میں میرے علاوہ، ابوالاثر حفیظ جالندھری، کوی جسیم الدین،
جمیل الدین عالی، ابن انشاء، اور آتے جید اور دوسرے ساتھی ہیں۔
سورج ڈوبنے کے قریب ہے اور ہمارا طیارہ ڈھاکے کے لئے اڑتا ہوا

میں پرواز کر چکا ہے۔
نیچے چٹاگانگ کا شہر پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑیاں اور —— جھیلیں کا شہر
—— چٹاگانگ شہر ایسے پھیلا ہوا ہے، جیسے تاریخ ہندوستان کی کتاب
پھیلی ہوئی ہے۔
اوپر سے بہت دور تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اور میں سچ مچ بہت دور
تک دیکھ رہا ہوں —— میری نظر آٹھویں صدی عیسوی تک دیکھ رہی ہے
آٹھویں صدی عیسوی جبکہ چٹاگانگ بھی دریائے کرنافلی کے کنارے
مچھیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس دریائے کرنافلی میں بادبانی کشتیوں کے
کاروان تیر رہے ہیں۔ ان کشتیوں سے لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے عرب سوداگر
اتر رہے ہیں۔ بادبانی کشتیوں جیسی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے پرتگالی تاجر کشتیوں
سے مال کی پیٹیاں چٹاگانگ کے ساحل پر اتار رہے ہیں۔
پھر وہ چٹاگانگ نظر آتا ہے، جس کی طرف مغل صوبیدار اسلام خان،
ہاتھی کی عماری میں تلوار سونتے چٹاگانگ پر دھاوا بول کے ایک بہت بڑے لشکر کی
راہ نمائی کر رہا ہے۔
۱۶۰۸ء میں مغل صوبیدار اسلام خان نے —— چٹاگانگ کو
فتح کر لیا ہے۔ اور اب چٹاگانگ کا نام اسلام آباد رکھا گیا ہے۔
ہوائی جہاز کی کھڑکی سے چٹاگانگ کی شاہی جامع مسجد کے اونچے مینار

کسی بزم رنگ و بو کی حسینہ کے مخروطی انگلیوں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ ۱۶۷۸ء سے اب تک اسلام کے نام کو فضاؤں میں بلند کرنے والی اس مسجد کو بنگالے کے حاکم شائستہ خان نے تعمیر کیا تھا۔

اس مسجد سے ذرا دور مشہور بزرگ پیر سلطان بایزید بسطامی کا روضہ بھی نظر آ رہا ہے۔

اب مسجدیں، درگاہیں اور مکانوں والا چٹاگانگ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور وہ کھیتوں، درختوں، تالابوں اور جھیلوں والا چٹاگانگ نگاہوں کے نیچے ہے جس کے بارے میں چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں لکھا تھا۔

"چٹاگانگ اس خوبصورت دوشیزہ کی طرح ہے جس نے ہری ہری گھاس کا مخملیں لباس پہن رکھا ہے۔ اور جھیلیں تالاب اس مخملیں لباس پر چمکیلے ہیروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور اس کے کندھوں پر دریائے کرنافلی کے آبی ساحل کا دوپٹہ لہرا رہا ہے۔"

وہ خوبصورت چٹاگانگ اب بہت نیچے اور بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ نیچے ڈھاکہ کے نواحی کھیت قالینوں اور دریوں کی طرح بچھے ہوئے ہیں۔ اور جہازوں کی جھنڈ میں ڈھاکے کے لال باغ کے کنگرے۔ چوک مسجد

ست گنبد مسجد اور کرتلاب خان مسجد کے مینار اور لکشمی نرائن اور جے کال کے مندروں کے کلس پھر سے نمودار ہو گئے ہیں اور سامنے پی آئی اے کے نوٹس بورڈ پھر سے روشن ہو گئے ہیں۔

"فاسٹن یور سیٹ بیلٹس"

"نو سموکنگ"

اور ڈیک کے لاؤڈ اسپیکر پر جہاز کی آواز گونج رہی ہے۔

"خواتین و حضرات! اب تھوڑی دیر میں ہم تیج گاؤں پی اے ایٹ ہوائی اڈے پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ امید ہے آپ کا یہ سفر خوشگوار گذرا ہوگا۔"

سفر بڑا خوشگوار تھا۔ لیکن سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہمیں ڈھاکے میں ٹھہرنا نہیں تھا۔ بلکہ ہوائی اڈے سے سیدھے کاروں کے کارواں کے ذریعے نرائن گنج جانا تھا جہاں سے ہم تیسری پاک جمہوریت اسپیشل یعنی اسٹیمر فلوٹیلا " [illegible] پاکستان کے مزید بیچے پر روانہ ہونے والے تھے۔ — ہماری کار میں مشرقی پاکستان کے [illegible] صحافی وحید قیصر ندوی (نمائندہ جنگ مشرقی پاکستان) بھی تھے۔ وحید قیصر ندوی دلچسپ حد تک گپی واقع ہوئے تھے۔ اور یہ دلچسپ اتفاق تھا کہ ہم جاوا تاراں گنج

رہے تھے لیکن نارائن گنج کی بجائے ذہبیہ قیصر ندوی کا گنج موضوع بحث تھا اور ذہبیہ قیصر ندوی اپنے گنج پر ہاتھ پھیر پھیر کر ہمیں بتا رہے تھے کہ "نارائن گنج اگرچہ ایک صنعتی شہر ہے اور اندرونی بندرگاہ ہے

لیکن وہ برصغیر کی سب سے بڑی جوٹ مل "آدم جی جوٹ مل" کے لئے بہت مشہور ہے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ نارائن گنج ڈیٹ پام شوگر، ہیئر لوشن، پالش کی ڈبیوں اور بالخصوص بھینس کی سینگوں سے بنائے ہوئے کنگھوں کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ اس لئے میں نے انہیں چھیڑا۔

"ندوی صاحب —— نارائن گنج بھینس کی سینگوں کے کنگھوں کے لئے بھی بہت مشہور ہے ——"

ندوی صاحب بالکل نہیں شرمائے ہم سب کے ساتھ بے تکلفی سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

اب ندوی صاحب کا گنج نظروں سے اوجھل تھا، کیونکہ سامنے نارائن گنج چراغاں چراغاں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ صدر ایوب کے آنے کی خوشی میں نارائن گنج نے بجلی کے بے شمار قمقموں سے شگفتہ نما زرق برق لباس پہن رکھا تھا

اور ہماری کاروں کا کارواں نارائن گنج کی دریائی بندرگاہ کے "تیز راجی"

پر پہنچ گیا تھا

نارائن گنج کی "تیز راجی" پر تیسری پاک جمہوریت اسپیشل کا اسٹیمر فلوٹیلا میں تین بڑے جہازوں جیسے اسٹیمروں پر مشتمل اسٹیمروں کا بیڑہ لنگر انداز تھا۔

ان تینوں اسٹیمروں میں ایک اسٹیمر بجلی کے رنگ برنگے قمقموں سے اس طرح سجا ہوا تھا، جس طرح شادی کے موقع پر کسی دلہن کا گھر چراغاں چراغاں ہوتا ہے یا قومی تہواروں کے موقع پر سرکاری عمارتیں سجائی جاتی ہیں —— اس اسٹیمر کا نام "میری اینڈرسن" تھا اور اس اسٹیمر میں صدر مملکت محمد ایوب خان سفر کرنے والے تھے۔ باقی جو دو اسٹیمر کھڑے تھے ان میں سے ایک کا نام کیوری تھا اور دوسرے کا شترمرغ۔

اردو زبان میں کیوری مرغابی نما پرندے کو کہتے ہیں۔ اپنے وطن پاکستان کے باشندوں نے اگرچہ کیوری کو نہیں دیکھا ہے لیکن کم از کم ہر پاکستانی نے کیوی بوٹ پالش کی ڈبیوں پر اس کی تصویر ضرور دیکھی ہے

دوسرے اسٹیمر کا نام "شترمرغ" تھا یعنی "شترمرغ" کے ہی ——

اور میرے حصے میں شترمرغ کی سواری آئی تھی —— جب میں شترمرغ پر سوار ہو رہا تھا تو ابن انشاء میرے بونٹ لمبے اونٹ جیسے قد پر پھبتی کسے بغیر نہ رہ سکا

"شترمرغ اشترمرغ پر سوار ہو رہا ہے"

اسٹیمروں کی روانگی میں ابھی کچھ دیر باقی ہے کہ صدر کے اسٹیمر میری ایلکسن، کے ریڈیو ٹیلی فون سے ایک بڑا مزیدار پیغام آیا کہ

"صدر محمد ایوب خان نے اپنے اسٹیمر پر اپنے ہمسفر ادیبوں کو مدعو کیا ہے"۔

ہم ادیبوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ادیبوں سے یہ بہانہ یا ہمیں یقین نہیں آتا تھا کیونکہ تاریخ تو یہی بتاتی چلی آئی ہیں کہ ہر محمود غزنوی نے فردوسی کی تلاش کی ہوتا ہے اور اپنا محبوب صدر ایوب بھی جیتا جاگتا محمود غزنوی ہے، جو جیتے جاگتے فردوسی کو نوازتا ہے!

اور یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہم ادیبوں میں ایک سچ مچ کا فردوسی بھی تھا، یعنی فردوسی اسلام ابو الاثر حفیظ جالندھری۔

صدر کے اسٹیمر "میری اینڈرسن" کا عرشہ ذاکبات اور مشروبات کی میزوں سے آراستہ تھا۔ ادیبوں کے علاوہ بہاولپور میں وزیر اطلاعات مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، میجر جنرل امراؤ خان اور بریگیڈیئر ایف۔ آر خان قابل ذکر تھے۔ قدرت اللہ شہاب جو پرنسپل سکریٹری " ہیں یعنی صدر مملکت کے پرائیویٹ سکریٹری کے علاوہ، پاکستان بھر کے ادیبوں کی نمائندہ جماعت کے بھی سکریٹری جنرل ہیں۔ آدھے میزبان تھے اور آدھے مہمان ـــــ یعنی صدر

مملکت کے سکریٹری کی حیثیت سے میزبان اور رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مہمان۔

چنانچہ جب صدر مملکت سے تعارف کے لئے ادیبوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا تو قدرت اللہ شہاب ادیبوں کی صف میں سب سے پہلے کھڑے ہو گئے ـــــ اور یہ حیثیت ادیب صدر صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد پھر بحیثیت سکریٹری صدر مملکت وہ صدر صاحب کے پیچھے ہو گئے اور ہم سب کا فرداً فرداً تعارف کرانے لگے۔

صدر ایوب سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے اس بات کی مطلق خوشی نہیں تھی کہ میں پاکستان کے حاکم اعلیٰ سے ہاتھ ملا رہا ہوں، بلکہ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس ہاتھ" نے آٹھ کروڑ انسانوں کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا تھا۔

اور جب ایوب کا نجات دہندہ ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ مصافحہ نہیں ہے بلکہ نئی حکومت اور پاکستانی ادب کے درمیان دائمی دوستی کی نئی کڑی ہے۔

اور جب صدر ایوب ہم ادیبوں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے تو یوں نظر آ رہا تھا جیسے یہ تصویر نہیں۔ بلکہ شیلف ہے جس میں افسانوں، ناولوں، گیتوں، نظموں اور غزلوں کی کتابوں کے درمیان قانون کی ایک ضخیم کتاب بھی رکھی ہوئی ہے۔

صمد کی دعوت ختم ہونے کے بعد ہم سب ادیب اپنے اپنے اسٹیمر پر لوٹے۔ اور جیسے سلسلے ادیب ایک دوسرے کے جذبات و سنجیدگی کے لمس کی لذت محسوس کر رہے تھے۔

کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ!

ابوالاثر حفیظ جالندھری، مرزا جمیل الدین عالی، ابن انشاء، سلمیٰ حمید، کرنل جسیم الدین، کرنل غلام مصطفیٰ، کرنل فرخ احمد اور میں اپنے آسٹرچ یعنی شتر مرغ کی پیٹھ پر پھر سے سوار تھے۔

شتر مرغ نے رینگنا شروع کر دیا۔ رات بھی گہری ہوتی جا رہی تھی اور دریائے پدما بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

ہم سب دوست مسافر آسٹرچ کے تکونے عرشے پر بید کی آرام کرسیوں پر نیم دراز اپنے ایک عزیز ملکی دوست مسٹر سبحان بیگ سے بڑی لذیذ باتوں میں مصروف تھے۔ بڑی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسٹرچ کے خاص لائٹ کی روشنی میں دریائے پدما کا پانی جھلمل جھلمل ہو رہا تھا اور ہمارے اسٹیمر کا کپتان ظفر صدیقی از راہ اتفاق سے طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو بھی تھا، لاہور کے نیلے یونیفارم میں ملبوس اپنی بڑی مونچھوں کی نوکوں کو مسل مسل کر اس طرح حق لنگ اور کر رہا تھا کہ

بیٹا ——— مشرقی پاکستان جوائنٹ اسٹیمر کمپنی کے پاس

کوئی پانچ سو کے لگ بھگ اسٹیمروں، لانچوں اور کشتیوں کا ایک زبردست بیڑہ ہے۔ بڑے بڑے اسٹیمر ہیں جن میں کیوی اور اپنا یہ آسٹرچ بھی شامل ہیں، یہ سارے اسٹیمر (FLAT BOTTOMED) ہیں۔ یہ پیندوں کے نیچے سے چپٹے ہیں۔ ان کی لمبائی ۲۲۵ فٹ ہے اور ان کی رفتار ۱۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ ان جہازوں کے ذریعہ پٹ سن، چمڑا، اور کھالیں، آئل سیڈز، چائے، تمباکو، مچھلی، درآمدات سیمنٹ، بائیسکلیں اور کوئلہ ......

ابھی ظفر صدیقی کی معلومات ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اے حمید نظامی بہت ہی تنگ آگیا۔

ظفر صدیقی۔ تمہارے مزے ہیں کہ کہ! پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری یہ بڑی بڑی مونچھیں اصلی ہیں یا تم نے انجینئروں کی طرح میک اپ کر رکھا ہے؟

انجینئروں کا ذکر چل نکلا تو ہم سب کو احساس ہوا کہ شتر مرغ کی سواری کیسی خطرناک خیز دلچسپ ہے!

اتنی حسین رات، ایسا سفر کبھی ہوا ——— بھئی واہ کیا کہنے کیا آہا آسٹرچ اسٹیمر ——— !!

ابن انشاء جیسے سب کو پڑھ رہا تھا۔

بادو — تم لوگوں نے وہ فلم دیکھی ہے "فرک ڈاؤن" وہ ساری فلم ایک ایسے ہی جہاز پر شروع ہوئی تھی اور ایسے ہی جہاز پر ختم ہو گئی تھی۔ اس میں اسٹریپ ٹیز میریلین منرو اور جین رسل نے کام کیا تھا۔

میریلین منرو اور کوری جسیم الدین!

جین رسل اور کوری غلام مصطفےٰ!!

برگمین، بلڈووٹ اور وحید قیصر ندوی!!!

سب دوست مسافر گونت اور ڈنر کھا کر اپنے اپنے کیبنوں میں سونے کے لئے چلے گئے۔

سویرے جو آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ ہمارے تینوں اسٹیمر آخر شب سے رکے کھڑے ہیں۔ کیونکہ ایک اور اسٹیمر "غازی" ریت میں پھنسا ہوا ہمارا راستہ روکے کھڑا ہے۔

کیبن سے باہر نکل کر عرشے پر آ کر ہم نے دیکھا تو بیچ میں غازی پھنسا کھڑا ہے — اور اس کی وجہ سے صرف ایک اور اسٹیمر ٹاؤ کو بھی ہمارے اسٹیمروں کی طرح بے بس رکا کھڑا ہے۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ نام غازی اور بیچ ریت میں پھنسا پڑا ہے! واہ رے غازی — واہ رے

رفتار کے غازی!!

پروگرام کے مطابق ہمیں صبح چھ بجے فرید پور ضلع کے اسٹیمر اسٹیشن گوالندو پر آ رکنا تھا — اور اس وقت نو بج رہے تھے۔ بلی — ایک ملم — ایک — اور ہر جہاز چیخ چیخ کر لمبے لمبے بانسوں سے دریا کی گہرائی ناپ رہے تھے۔ لیکن غازی کسی طرح بھی اپنی جگہ سے ہٹتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس لئے ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعے ساحل پر پیغام بھیجے گئے اور حسن بادرس ٹرانسپورٹ کمپنی کی لانچیں آ گئیں اور ہم اسٹیمروں سے لانچوں میں چھلانگیں مار کر سوار ہو گئے۔ ورنہ پھر ہمارا بھی وہی حشر ہوتا جو غالباً ہمارے ملک کی فلم "وائلڈ ایڈیٹنٹ بیری ز" کے تین ملاحوں کا ہوا تھا — وہ تینوں ملاح بھلا اسی طرح ... سمندر میں پھنس گئے تھے — ان کے پاس اناج اور پانی ختم ہو گیا تھا۔ اور وہ پھٹے پرانے کپڑوں اور بڑھی ہوئی داڑھیوں سے چیخا کرتے تھے۔

نائٹ — واٹر — ایڈی میر — ناشتے

ڈراپ ڈرنک —

ہماری لانچ استطاعت سے زیادہ بھری ہوئی تھی اور ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ ادھر سے ادھر چلیں پھریں نہیں — اور جب بھی کوئی اپنی جگہ سے اٹھتا تو پروگرام حفیظ جالندھری بزبان شعرا سے خبردار کرتے سے

ایسے عمل پہ دوستو زندگی ہے خودکشی
ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

کوئی دوپہر کے قریب ہم گولنڈو گھاٹ اسٹیمر اسٹیشن پر پہنچے۔ اسٹیمر اسٹیشن سے گولنڈو اسٹیشن کوئی دو فرلانگ دور ہے —— اور ہم گولنڈو گھاٹ ریلوے اسٹیشن سے براڈ گیج پاک جمہوریت اسپیشل میں سوار مشرقی پاکستان کے منزل سفر پر رواں ہوئے۔

مغرب مقابلتاً مشرق سے زیادہ متمدن ہوتا ہے، چنانچہ مشرقی پاکستان کا یہ مغربی حصہ بھی مشرقی حصہ سے زیادہ متمدن نظر آیا —— کیونکہ ریل کی کھڑکی سے جو دیہات اور جو دیہاتی باشندے نظر آ رہے تھے بالخصوص عورتیں —— وہ مشرقی پاکستان کے مشرقی حصے سے زیادہ متمدن لگ رہی تھیں —— مشرقی پاکستان کے مشرقی حصے کی خواتین میں پردے کی ایسی سخت پابندی دیکھی کہ خواتین برقعہ اوڑھنے کے علاوہ چھتری بھی تانے رہتی تھیں، لیکن اس حصے کی عورتیں برقعے اور چھتریوں سے بے نیاز تھیں، یہاں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی اسکولوں کی عمارتیں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

ٹرین دوڑی جا رہی تھی۔

زوم زوم چھکا چھک چھکا چھک

صدر ایوب کی ایک جھلک دیکھنے کے متمنی ہزاروں لاکھوں مرد عورتیں اور بچے اس علاقے کی مشہور مچھلی "ہلسہ" کی طرح بچھے ہوئے تھے —— ٹرین دوڑ رہی تھی —— زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔

فرید پور ڈسٹرکٹ کا صدر مقام فرید پور —— ایوب کا دربار جہانگیری —— فرید پور کے لوگ، فرید پور کے کرنل کے ذخائر پیتل کے برتن، ہلدی، چنا، کھجوریں، تربوز اور بنیادی جمہوریت!

پاک جمہوریت اسپیشل ٹرین رواں دواں ہے۔ ٹیلیفون کے کھمبے اور پٹ سن کے کھیت پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

راجباڑی اور کمار کھالی کے اسٹیشن پیچھے رہ گئے ہیں کشتیا کا اسٹیشن قریب آ رہا ہے۔ کشتیا جو جولاہوں، نیلاہوں، مچھلیوں اور ہوزری کی ملوں کے لئے بہت مشہور ہے۔ افق پر گھاس کے سیاہ دھبے سے اہل مشلا رہے ہیں اور ہوزری کی ملوں کی سیاہ لمبی لمبی چمنیاں اونچی ہو ہو کر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی ہیں۔

جھاڑیوں کے جھنڈ سے شکر کے کارخانے اور شکر توڑنے والی انجینئرنگ شاپ کی اجلی عمارت نظر آ رہی ہے۔ مشرقی پاکستان محکمۂ اطلاعات کا چھوٹا دیر

بتا رہا ہے۔

"یہ گنگا کوباڈاک پروجیکٹ" ہے۔ اس پروجیکٹ کے پہلے پمپ
یونٹ سے ۔۔۔ [illegible] علاقہ سیراب ہوگا اور (۲۶۰،۰۰۰)
ٹن اناج پیدا ہوگا۔

کوچ غلام مصطفے کھڑکی سے انگلی کا تیر تانے ہوئے ہم سب کو بتا
رہے ہیں۔

"ادھر ان پہاڑیوں کے دامن میں وہ جو آم کے درختوں میں گھرا
ہوا گاؤں نظر آرہا ہے، وہ رابندر ناتھ ٹیگور کا آبائی وطن ہے
حکومت پاکستان نے ٹیگور کے گھر کو یادگار کے طور پہ محفوظ کر
لیا ہے۔ اور سنا ہے کہ ٹیگور نے "گیتان جلی" اسی دیہات
میں لکھی تھی"

گنگا کوباڈاک پروجیکٹ اور رابندر ناتھ ٹیگور!

شکر کا کارخانہ اور گیتان جلی!!

اب ریل کے انجن کی آواز کچھ اور کہہ رہی ہے یعنی

"چائے مکھن، ڈبل روٹی —"

"چائے مکھن ڈبل روٹی —"

اور ہم چائے مکھن، ڈبل روٹی کی آواز کے ساتھ ساتھ ناشتہ کی میز پر
بیٹھے ہیں۔ نئی صبح کے سورج کی روشنی میں آنکھوں کے سامنے شمال مغربی
مشرقی پاکستان پھیلا ہوا ہے۔ ٹرین دیناج پور ضلع کے بڑے شہر پاربتی پور
سے آگے نکل آئی ہے، اور پاربتی پور کا مشہور سلک، پٹ سن کی چٹائیاں
اور بید کی کرسیاں نظروں سے اوجھل ہیں،

اور ہم پھر واپس گوالنڈو اسٹیمر اسٹیشن کے ساحل پر اپنے شتر
مرغ "آسٹرچ" پر سوار ہیں۔

اور شتر مرغ دریائے پدما میں تیرتا ہوا [illegible] نارائن گنج کی طرف بڑھ
رہا ہے۔

پھر وہی مشرقی پاکستان کی حسین رات اور فلڈ لائٹ کی لمبی روشنی میں
دریائے پدما کا جھل مل جھل مل پانی۔

سامنے حفیظ جالندھری بیٹھے ہیں اور تصور میں پانچ نمبر کیبن کی گول کھڑکی
سے میریلین منرو جھانک رہی ہے

نارائن گنج —— اور نارائن گنج سے ڈھاکہ —— وادی گزر
گیا ہے۔ رات پھیل چکی ہے —— اور پاک جمہوریت کا کارواں اپنے اس
سفر کی آخری منزل سلہٹ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

محنت کش عورتیں!

چائے اور پاک جمہوریت!!

سارے سلہٹ میں عوام ایوب خان کے گرد جمع ہیں — اور پھر اب جیسے "پاک جمہوریت" کے بیج ان کے دلوں میں بکھیرتا پھر رہا ہے۔

اسلام کی قندیلیں اور پاک جمہوریت کا اجالا — سلہٹ جگمگا رہا ہے — اور پاک جمہوریت کا کارواں اپنے مقصد سفر کو پورا کر کے پھر ڈھاکے کی طرف لوٹ رہا ہے۔

چائے کے باغات، بانس کے جنگل، پٹ سن کے کھیت، انناس کے باغ، کیلوں کے باغ اور آم کے باغ،

پاک جمہوریت اسپیشل چھک چھک چھک، چھک گاڑی چلی جا رہی ہے اور آموں کے جھنڈ میں کوئل کوک رہی ہے۔

"کوہو — کوہو"

اور میرا دل ایک بنگلہ لوک گیت گنگنا رہا ہے۔

"اے اچھی اور پیاری کوئل!

تو اونچی شاخ پر بیٹھی ہے۔ تیری آنکھیں تیز ہیں

ذرا اونچی شاخ سے نظر دوڑا!

میری محبوبہ کہیں چائے کے باغوں میں تو نہیں چھپی ہے!

میری محبوبہ — میرے رقیب کے ڈر سے چھپ رہی ہے

برہم پترا تو نہیں پار کر رہی ہے — !

میری اچھی کوئل! — !

اڑ جا اور میری محبوبہ کا پیغام لا —"

کلکتہ، سری منگل، شائستہ گنج، اکھوڑا اور برہمن باڑیہ کے اسٹیشن پیچھے رہ گئے ہیں، اندھیرے میں ڈھاکہ دور سے پھر جھلمل جھلمل نظر آ رہا ہے — اور کوی فرخ احمد بڑی درد ناک لے میں آنکھیں بند کئے ٹیگور کا یہ گیت الاپ رہا ہے۔

اللہ میگھ دے پانی دے چھایا دے تو ای

اللہ میگھ دے ———

ڈھاکہ اسٹیشن پر اطلاع ملی کہ لاہور، پنڈی، پشاور، سکھر اور کراچی سے بہت سارے ادیب ساتھی ڈھاکہ پہنچے ہوئے ہیں۔

اور جب ہم پارٹی ہاؤس پہنچے تو دیکھا کہ پاکستانی ادب کے سارے "بادل گرجے" وہاں موجود ہیں، شاہد احمد دہلوی، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر وقار عظیم، نسیم حجازی

حمید ہاشمی، میرزا ادیب، شوکت صدیقی، اعجاز بٹالوی، احمد راہی،
محمد خالد اختر، اشفاق احمد، اختر انصاری اکبر آبادی، فخر ماتری، جمیل جالبی،
ناصر کاظمی، شہرت بخاری، یونس احمر، شیخ ایاز ——— اور حضرت
منیر نیازی۔

سکندر مرزا ہال میں سارے ادیب جمع ہیں۔ جگر دادا، نیز ہاں ہے اور
اردو زبان بہاں ———

کراچی جسیم الدین کے گھر بریانی اور لوک گیت، بس گلی اور لوک ماہیوں کی
ضیافت ہے ——— سارے ادیب فرش پر حلقہ باندھے بیٹھے ہیں۔ دبلی، پتلی
لچکیلی کرمالی سی جوا ——— پندرہ برس کا یا سولہ کا سن ———
چھم چھم ناچتی بولی گا رہی ہے۔
بندھوا اردنگیلا اور نگیلا رے
ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے بنگال کا سارا حسن کوی جسیم الدین کے
دیوان خانے میں سمٹ آیا ہے۔

آج ڈھاکہ میں بلکہ مشرقی پاکستان میں ہمارا آخری دن ہے، میں اور ابن
انشا، اپنے ایک بنگالی دوست ذکریا ابراہیم (منیجر محمدی ارونگ مل)

کی کار میں ڈھاکے کی سڑکوں پر گھوم رہے ہیں جناح ایونیو، نواب پور روڈ۔
نیو مارکیٹ، صدری بازار، اسلام پور، وہ پٹواٹولی
ڈھاکے کی ململ کے دوپٹے، رنگ برنگی ساڑھیاں، بانس کی تیلیوں کے
خوبصورت لیڈیز بیگ، زین العابدین پینٹنگز، چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور ڈو کے
——— جی چاہتا ہے کہ سارا ڈھاکہ خرید لیں۔
سامان سمیت ہی ہم ریڈیو پاکستان پہنچے ——— اور اپنے مشرقی
پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کو ریڈیو مائیکروفون سے خدا حافظ کہا۔

اب سب دوست بچھڑ رہے ہیں ——— میں ابن انشا، اور
ابوالاثر حفیظ جالندھری سارے ساتھیوں سے گلے مل کر تیج گاؤں کے ہوائی
اڈے پہنچ گئے ہیں۔
رات گہری ہو چکی ہے۔ اور پی آئی اے کا سپر کانسٹیلیشن پرندہ پرے
کراچی کی طرف اڑ رہا ہے۔
نیچے ہندوستان ہے اور وہ جنوب کی طرف اندھیرے میں وہ گھر بھی
کہیں ہے جہاں میں نے پہلی بار آنکھ کھول کر اس دنیا کو دیکھا تھا۔
میں نیچے کے اندھیرے میں بہت دور تک چلا گیا ہوں اور اس اندھیرے

ہیں جیسے کھو سا گیا ہوں ۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں اور فلائٹ اسٹیورڈ سلیم مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا ہے ۔

"اپنا سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے —— ہم تھوڑی ہی دیر میں کراچی کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں"

تھینک یو فلائٹ اسٹیورڈ سلیم ! تھینک یو ویری مچ سلیم !!

مشرق کی طرف سے اجالے کا غبار اڑتا چلا آ رہا ہے ، عجیب بات ہے !

ہم جب ڈھاکہ پہنچے تھے ، تب بھی اجالا ہو رہا تھا اور اب ہم کراچی پہنچ رہے ہیں تب بھی اجالا ہو رہا ہے ۔!!

کیا ہر سفر کا اندھیرا اسی طرح منزل کے اجالے پر ختم ہوتا ہے —— !؟

صبح کا اجالا اور پی آئی اے کا پرندہ زمین پر اتر رہے ہیں اور پیاری کراچی نے مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دی ہیں — کھول کر ۔

کراچی کی نرم گرم آغوش میں محبت کا کیسا گداز ہے ، کتنا لوچ

ہے اور کتنا سکون ہے —— !!

"۱۰ ۔ میری پیاری کراچی —— !!"

(ختم شد)

اُخاہ آپ ہیں ابراہیم جلیس۔ ٹوپی اور پگڑی تھام کر اُوپر دیکھنا پڑتا ہے۔ نام سُنا اور لوگوں کی طبیعت کا کنول کھلا۔ ایسا باغ و بہار اور خوش فکر مصنف بھی اُردو میں کم گزرا ہے۔ ان کے پہلے افسانے "یورش دوانی عہد کی ایک شام" ہی سے ان کی اقلیم ہند میں دُھوم ہوگئی تھی۔ پھر تو یہ باقاعدہ پڑھنے والوں کا کریز بن گئے۔ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں، جوان ہیں۔ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ پاکستان آگئے۔ چین و ماچین کی سیر کر چکے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں لیکن طبیعت کی چلبلاہٹ سادگی معصومیت اور مبالغہ آمیزی نہیں جاتی۔ "جنگ" میں ان کا کالم لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں۔

لارک پبلشرز